وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

اور جو کوئی تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبردار ہوگی اور اچھے عمل کرے گی ہم اس کا اجر اسے دو چند دیں گے اور ہم نے اس کے لیے عزت والا رزق تیار کیا ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

اے نبیؐ کی عورتو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔ سو نرم آواز میں بات نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ جس کے دل میں بیماری ہے طمع کرے اور نیکی کی بات کہو۔ (2650)

وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ

اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو (2651) اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ

2650- ﴿اِنِ اتَّقَيْتُنَّ﴾۔ نفی مشلیت کے لیے شرط ہے یعنی اگر تقویٰ کرو تو تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں۔ اور تقویٰ سے مراد یہاں ان ذمہ داریوں کا مدنظر رکھنا ہے جو ان کے منصب کے لحاظ سے کہ وہ نبی کی بیبیاں ہیں ان پر عائد ہوتی ہیں۔ اور بعض نے اِتَّقَيْتُنَّ بمعنی اِسْتَقْبَلْنَ لے کر اسے اگلے حصہ کے متعلق کیا ہے۔ یعنی اگر تمہارے سامنے کوئی شخص آجائے۔ (ر) اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اگر تم (تہمت وغیرہ سے) بچنا چاہتی ہو تو بات میں بھی ملائمت اختیار نہ کرو۔ اور [خَضَعَ بِالْقَوْلِ] کے لیے [دیکھو نمبر: 2403]۔ اور **عورتوں کی طرز کلام** میں عموماً نرمی اور ملائمت ہوتی ہے۔ مگر چونکہ ان کا منصب تعلیم دینا تھا اور اس کے لیے ہر قسم کے لوگوں کا ان کے پاس آنا ضروری تھا، اس لیے فرمایا کہ طرز کلام ایسی نہ ہو کہ ایسے شخص کے دل میں جو بدخیالات اپنے اندر رکھتا ہے (اور مَرَضٌ سے یہاں یہی مراد ہے) طمع پیدا ہو۔ اور ﴿قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ میں پھر انہیں ان کے اصل کام کی طرف توجہ دلائی یعنی نیکی کی باتیں لوگوں کو پہنچانا۔ اور یہاں گو حکم نبی ﷺ کی بیبیوں کو ہے مگر چونکہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ ہیں اس لیے دوسری عورتوں کو بھی ضمناً حکم ہے کہ جب انہیں غیر محرم مردوں سے کلام کرنا پڑے تو ایسی آواز سے کلام نہ کریں جو دوسروں کے کشش کا موجب ہو، بلکہ مردانہ انداز کلام اختیار کریں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا اجنبی مردوں سے کلام کرنا منع نہیں۔

2651- ﴿قَرْنَ﴾ اصل میں اَقْرِرْنَ ہے۔ اور قَرَّ کے لیے [دیکھو نمبر: 960]

﴿تَبَرُّجَ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 2347]۔ اور بخاری میں ہے [التَّبَرُّجُ: أَنْ تُخْرِجَ مَحَاسِنَهَا] (صحيح البخاري، كتاب

الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے اے اہل بیت ناپاکی کو دور کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔ (2652)

التفسیر، باب قَوْلِهٖ (يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا) یعنی ﴿تَبَرُّجَ﴾ کے معنی ہیں اپنا بناؤ سنگار دکھانا۔

﴿الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ جَاهِلِيَّةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 546] اور مراد اس سے قبل اسلام زمانہ ہے اور اسے اُوْلٰی اس لیے کہا کہ ہر متقدم اوّل اور اُوْلٰی ہے۔

جاہلیت میں عورتوں کا بن سنور کا باہر نکلنا عام طور پر مروج تھا اور وہ بہت باریک لباس پہن کر نکلتی تھیں یا بعض حصے جسم کے کھلے رکھ کر نکلتی تھیں تاکہ مردوں کو اپنی طرف مائل کریں، جس طرح آج یورپین عورتیں نکلتی ہیں۔ پس گھروں میں ٹھہرا رہنے اور بناؤ سنگار نہ دکھانے کو ایک جگہ جمع کرنے کا یہی مطلب ہے کہ اس غرض کے لیے باہر نہ نکلو۔ **حاجات ضروری کے لیے باہر نکلنے سے منع نہیں کیا گیا**، بلکہ حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنی بیبیوں کو فرمایا: [أُذِنَ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ] (صحیح البخاری، باب قَوْلِهٖ: لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ...: 4795) (ر) یعنی تمہیں اجازت ہے کہ اپنی حاجت کے لیے باہر نکلو۔ اور عورتوں کا جنگوں میں جانا اور اپنی دیگر ضروریات کے لیے باہر نکلنا، مسجدوں میں جانا بہت حدیثوں سے ثابت ہے۔ حتی کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی بیبیوں کو جنگوں وغیرہ میں ساتھ لے جاتے تھے۔ اور جن لوگوں نے **حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ جمل میں** باہر نکلنے پر اعتراض کیا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے۔ آپ ایک عظیم الشان فتنہ کی اصلاح کے لیے باہر نکلیں اور کسی صحیح غرض کے لیے عورت کا باہر نکلنا ممنوع نہیں۔ ہاں اپنا بناؤ سنگار غیر مردوں کو دکھانا ممنوع ہے۔ ﴿قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ کے یہ معنی لینا کہ عورتیں گھروں کی چار دیواری میں قید رہیں اور کبھی باہر نہ نکلیں، نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کے سراسر خلاف ہے۔

2652- ﴿اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ اَهْلٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 137] ﴿اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ وہ ہوں گے جن کو ایک گھر جمع کرے۔ اور گھر میاں بی بی اور بچوں کو جمع کرتا ہے۔ پس ایک شخص کے اہل بیت بی بی اور بچے ہیں۔ اور لسان العرب میں ہے کہ اہل بیت نبوی سے مراد آپ کی بیبیاں اور آپ کی بیٹیاں اور آپ کا داماد ہیں۔ اور ایک قول ہے کہ آپ کی بیبیاں مراد ہیں اور تمام وہ لوگ جو آپ کی آل ہیں اور داماد کی شمولیت بظاہر دقت طلب ہے، اس لیے کہ خسر اور داماد ایک گھر کے رہنے والے نہیں ہوتے۔

یہاں اہل بیت سے کیا مراد ہے؟ بعض روایات کی بنا پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اہل بیت میں بیبیاں شامل نہیں اور مراد اس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ اور حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ ہیں۔ کچھ روایات اس کے متعلق حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہیں کہ وہ فرماتی

وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اور اسے یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور

ہیں کہ یہ آیت میرے گھر میں نبی ﷺ پر نازل ہوئی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ اور حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ وہاں آئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو ایک چادر کے نیچے لے کر دعا کی کہ یہ میرے اہل بیت ہیں انہیں پاک کر اور جب حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے درخواست کی کہ انہیں بھی شامل کیا جائے تو آپؐ نے فرمایا کہ تم ازواج میں سے ہو۔ اور [وَاثِلَةَ بْنَ الأَسْقَعِ] سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اور وہاں علی رضی اللہ عنہ اور حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لے کر دعا کی، اور بعض اور بھی روایات ہیں۔ ان کے مقابل پر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت خصوصیت سے نبی ﷺ کی بیبیوں کے بارہ میں نازل ہوئی اور یہی عکرمہ کا قول ہے۔ (ث) لیکن اگر ہم خود قرآن کریم پر غور کریں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ یہاں ساری وہ ہدایات جو موجب تطہیر ہو سکتی ہیں یعنی زینت دنیوی کا ترک کرنا، اللہ اور رسول کی اطاعت، امر بالمعروف، گھروں میں ٹھہرنا، محاسن کی نمائش نہ کرنا، نماز کا قائم کرنا وغیرہ سب بیبیوں کے لیے ہیں، اور اس ٹکڑے سے پہلے بھی انہی کا ذکر ہے اور بعد میں بھی انہی کا۔ ﴿وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى﴾ تو یہ سیاق اس خیال کو ردّ کرتا ہے کہ یہاں مراد بیبیاں نہیں۔ پھر لغت کی رو سے اہل بیت کا لفظ اول بی بی پر آئے گا اور ثانیاً اولاد پر۔ اور قرآن کریم میں خود بی بی پر یہ لفظ بولا گیا ہے دیکھو ﴿رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ [هود: 73:11] ''اے اہل بیت! اللہ کی رحمت اور برکتیں تم پر ہیں۔'' جہاں اہل بیت سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی ہیں۔ اور یہ خیال کہ ﴿لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ﴾ اور ﴿لِيُطَهِّرَكُمْ﴾ میں ضمیر مذکر ہے اس لیے بیبیاں مراد نہیں، نہایت ہی بودا ہے۔ ضمیر بلحاظ لفظ مذکر ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی کے لیے فرمایا: ﴿بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾۔ ہاں وہ احادیث جن میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسین رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے اسی معنی میں صحیح ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بیٹی اور اس کے ساتھ اس بیٹی کی اولاد اور خاوند کے لیے بھی دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی اس آیت کا مصداق کرے اور انہیں بھی **رجس سے پاک کردے** اور ایسی وسعت لفظ کے معنی میں بالکل جائز اور صحیح ہے۔ اور بعض روایات میں جو اس قسم کے الفاظ آتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ [أَنْتِ مِنْ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَأَنْتِ عَلٰى خَيْرٍ] (شرح مشكل الآثار، جلد2، صفحہ239) تو بھلائی کی طرف ہے کیونکہ تو نبی کی بیبیوں سے ہے، تو یہ بھی اسی نتیجہ کی مؤید ہے۔ یعنی آپ کا مطلب یہ تھا کہ تم تو پہلے ہی اس آیت کی مصداق ہو۔ اور اہل بیت کے لفظ کو وسعت دے کر امت کے برگزیدہ لوگ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں۔ اور جیسا کہ خود واثلہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا میں بھی آپ کے اہل میں سے ہوں؟ تو آپؐ نے فرمایا [أَنْتِ مِنْ أَهْلِي] (شرح مشكل الآثار، جلد2، صفحہ 237) بہرحال اول مصداق اس آیت کا ازواج مطہرات ہیں اور ثانیاً اس میں آنحضرت ﷺ نے اپنی صاحبزادی اور ان کے خاوند اور فرزندوں کو بھی داخل کیا اور ثالثاً امت کے برگزیدہ لوگ اس میں شامل ہیں۔ اور تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات نے اپنے آپ کو اس آیت کریمہ کا مصداق ثابت کیا۔ کیونکہ سب سے بڑی ناپاکی دنیا کے مال کی محبت ہے۔

اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ ع

حکمت سے پڑھا جاتا ہے۔ اللہ باریک باتوں کا جاننے والا خبردار ہے۔ (2653)

اسی سے طرح طرح کی بدیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہی مال کی محبت ہی دل میں خدا کی محبت کی جگہ لے لیتی ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کی بیبیوں کے متعلق جس بات کا یہاں ذکر ہے وہ یہی تھی کہ انہوں نے مال کا مطالبہ کیا تھا۔ پس اصل مقصد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہے کہ اس رجس اور اس کے ساتھ ہر قسم کی برائیوں سے اہل بیت نبوی کو پاک کر کے انہیں امہاتِ اُمت صحیح معنی میں بنائے تا کہ وہ بھی رسول کے ساتھ امت کی روحانی پرورش کرنے والیاں اور امت کے لیے نمونہ ہوں۔ یہی ارادۂ الٰہی تھا کہ جب بیبیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ دنیا کا مال لے کر نبی ﷺ سے علیحدہ ہو جائیں تو انہوں نے مال دنیا پر لات ماری اور غربت اور فاقہ میں نبی ﷺ کی رفاقت اختیار کی۔ اور تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بیبیوں کے دل میں مال دنیا کی ایک تنکے کے برابر بھی وقعت نہ تھی۔ خلفائے وقت جب ان کے پاس کچھ مال بھیجتے تو وہ فوراً اسے اللہ کی راہ میں دے دیتیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق یہاں تک ثابت ہے کہ بعض وقت رات کے لیے بھی انہوں نے اپنے گھر میں کچھ نہیں رکھا اور سب کا سب اللہ کی راہ میں دے دیا۔ آج مسلمان بیبیاں اگر ازواج مطہرات کے نمونہ پر عامل ہوں تو مسلمانوں کی حالت دنوں میں پلٹ سکتی ہے۔

2653- ﴿حِكْمَةٌ﴾ [دیکھو نمبر: 164 و 321] اور یہاں مراد فہم قرآن ہے جو نبی ﷺ کو دیا گیا یعنی سنت نبوی۔ خواہ حدیث کے رنگ میں آپ کے اقوال میں ظاہر ہوئی ہو یا اخلاق کے رنگ میں یا آپ کے افعال میں۔ اور قتادہ سے اس کے معنی ابن جریر نے سنت ہی روایت کیے ہیں اور خود بھی یہی معنی قبول کیے ہیں۔ [مَا اَوْحِيَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ اَحْكَامِ دِيْنِ اللّٰهِ وَلَمْ يُنْزِلَ بِهِ الْقُرْاٰنُ وَ ذٰلِكَ السُّنَّةِ] (تفسیر الطبری، جلد20، صفحہ 268) (ج) اور حکمت کے معنی سنت بخاری میں بھی مروی ہیں۔ اس کی تفسیر سنت سے بھی کی گئی ہے اور ان نصائح سے بھی جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائے۔ (د) اور يُتْلٰى کا لفظ اس کے خلاف نہیں اس لیے کہ تَلَا کے معنی پیروی کے بھی آتے ہیں۔

رکوع کی اس آخری آیت میں کھول کر بتایا کہ یہ جو کہا گیا ہے وہ امہات المومنین ہیں اور معمولی عورتوں کی طرح نہیں کہ ان پر کچھ حقوق خاوند یا اولاد کے ہوں تو یہ غرض کس طرح پوری ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہاں انہیں ان کا وہ خاص کام بتایا گیا اور وہ **آیات اللہ اور اقوال و افعال نبوی کا محفوظ رکھنا تھا**۔ اور محفوظ رکھنے کی یہی غرض تھی کہ اسے لوگوں کو پہنچایا جائے، اور وہ لوگوں کے لیے ہدایت اور نور کا موجب ہوں۔ یہ وہ پاک غرض تھی جس کے لیے نبی ﷺ کی بیبیاں آپ کے گھر میں تھیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مدنی زمانہ میں شرائع کی تفاصیل اور مختلف قسم کے امور اس قدر تھے کہ اکیلی بی بی اسے محفوظ نہ رکھ سکتی تھی۔ تعدد ازواج کی اور بھی وجوہات ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق دکھانے والے مرد اور صدق دکھانے والی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر تیار کیا ہے۔ (2654)

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ

اور نہ یہ کسی مومن مرد نہ کسی مومن عورت کو شایاں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو وہ اس معاملہ میں کچھ (اپنا) اختیار سمجھیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی

2654- یہاں ان تمام اعلیٰ صفات میں جو اللہ کے لیے نزدیک مردوں کو بلند مرتبہ پر پہنچاتی ہیں عورتوں کو شریک کر کے یہ بتایا کہ **عورتیں بھی اللہ کے ہاں مقامات عالیہ حاصل کرنے میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں**۔ اسی لیے آخر پر مغفرت اور اجر عظیم کا ذکر کیا ہے اور مغفرت سے مراد یہاں حفاظت الٰہی ہی ہے۔ اور یہ بتا دیا ہے کہ جس اجر کے مرد مستحق ہیں اسی کی مستحق عورتیں بھی ہیں۔ چونکہ پچھلے رکوع میں ازواج رسول کا ذکر تھا اس لیے ایک تو اس مناسبت سے یہاں عورتوں کا ذکر مردوں کے ساتھ کیا ہے اور دوسرے اس مناسبت سے کہ صرف ازواج رسول کے لیے مقامات عالیہ مخصوص نہیں، کیونکہ وہاں فرمایا تھا ﴿لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ بلکہ سب عورتیں انہی بلند مقامات کو حاصل کر سکتی ہیں۔ تعجب ان لوگوں پر ہے جو باوجود قرآن کریم کی ایسی صریح تعلیم کے جس کی رو سے عورتیں مقامات عالیہ کے حاصل کرنے میں مردوں کے ہم پایہ قرار دی گئیں یہ راگ الاپتے ہیں کہ اسلام نے عورت کی عزت نہیں کی اور اسلام کی تعلیم کی رو سے عورت میں روح ہی نہیں۔

رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾

نافرمانی کرتا ہے وہ کھلی گمراہی میں دور نکل گیا۔ (2655)

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾

اور جب تو اسے جس پر اللہ نے انعام کیا اور جس پر تو نے انعام کیا، کہتا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور اللہ کا تقویٰ کر اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپاتا ہے جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔ اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے اور اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تو اس سے ڈرے۔ پھر جب زید نے اس سے قطع تعلق کر لیا تو ہم نے اسے تیرے نکاح میں دے دیا۔ تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے، جب وہ ان سے قطع تعلق کر لیں۔ اور اللہ کا حکم ہو کر رہتا ہے۔ (2656)

2655- اس آیت کے بارہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، مجاہد وغیرھم سے مروی ہیں کہ یہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا یعنی رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی اسیمہ کی بیٹی اور اس کے بھائی عبداللہ کے معاملہ میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے زینب کے زید سے نکاح کے لیے درخواست کی تو زینب نے انکار کر دیا اور اپنے خاندانی شرف کو پیش کیا اور ایک آزاد کردہ غلام سے نکاح پر راضی نہ ہوئی اور اس کے بھائی نے بھی اس کی تائید کی۔ (ج۔ر) چونکہ اسلام کی غرض ان تفریقات کو مٹانا تھا اور سب مسلمانوں کو خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں ایک کرنا تھا اس لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ یوں ہر ایک مسلمان کو اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کا نکاح کرے، لیکن چونکہ اس انکار سے اسلام میں تفریق پیدا ہوتی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح فرمائی اور اس آیت کے نزول پر زینب رضی اللہ عنہا اور اس کا بھائی رضامند ہو گئے۔ پس یہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے کہ **مسلمان ایسے تعلقات میں خاندانی اور قومی تفریقات پیدا نہ کریں**۔ زید رضی اللہ عنہ گو آزاد کردہ غلام تھا مگر بلحاظ شرافت اخلاقی کے وہ قریش سے کم نہ تھا اور جب ایک عورت نے خاندانی شرافت کو اخلاقی شرافت پر ترجیح دی تو اسے اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے ہر ایک خیال کو قرآن کریم کے سامنے قربان کرتے تھے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو قومی اور خاندانی شرف کے خیال کو قرآن کریم کی تعلیم کے سامنے قربان کرنے والے ہیں۔ اور یہاں لفظ عام اختیار فرمائے ہیں تاکہ تمام حالات پر حاوی ہو سکیں اور صرف ایک واقعہ پر محدود نہ ہوں۔

2656- وَطَرٌ بڑی حاجت کو کہتے ہیں۔ (غ) پس قضائے وَطَرٌ کے معنی حاجت کا پورا کر لینا ہوئے اور یہاں مراد اس سے قطع تعلق یا

طلاق ہے۔

﴿ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ ﴾ سے مراد زید رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ آگے خود بتا دیا۔ **زید بن حارثہ** رضی اللہ عنہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ قید ہو گئے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ بطور غلام فروخت ہوئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تو انہوں نے یہ غلام آپ کو دے دیا۔ اس اثنا میں زید رضی اللہ عنہ کو شام کی طرف سفر پیش آیا اور وہاں ان کے چچا نے انہیں پہچان لیا اور سب حالات دریافت کر کے ان کا والد اور چچا اور بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معاوضہ دے کر اسے لینا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا میں اسے اختیار دیتا ہوں وہ اگر چاہے تو تمہارے ساتھ چلا جائے میں معاوضہ کچھ نہیں لیتا۔ زید رضی اللہ عنہ کو جب یہ کہا گیا تو اس نے کہا کہ میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا اور میرے لیے آپ باپ اور چچا سے بڑھ کر ہیں۔ تب آپؐ نے اسے آزاد کر دیا۔ ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ ﴾ میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور ﴿ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسلام کے ذریعہ بڑا بلند مرتبہ عطا فرمایا۔ ان کے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ذکر پچھلے نوٹ میں ہو چکا ہے، یہاں طلاق کا ذکر ہے۔ ﴿ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ ﴾ سے صاف پایا جاتا ہے کہ **زید** رضی اللہ عنہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا چاہتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روکتے تھے۔ آیا اس معاملہ میں قصور زینب رضی اللہ عنہا کا تھا یا زید رضی اللہ عنہ کا۔ اگر زینب رضی اللہ عنہا کا قصور ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم زید رضی اللہ عنہ کو طلاق سے نہ روکتے۔ یہی ﴿ اتَّقِ اللّٰهَ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے اور الفاظ ﴿ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ﴾ میں گو عام طور پر خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لیا گیا ہے۔ اگر یہی صحیح ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ چاہتے تھے کہ جس عورت کا نکاح ایک آیت قرآنی کے نزول پر ہوا ہے اب ناچاقی ہو کر وہاں طلاق واقع ہو۔ جس پر معترض طرح طرح کی باتیں بنائیں گے، اور یہی آپ کا لوگوں سے ڈرنا تھا۔ یعنی آپ فی الحقیقت لوگوں سے نہ ڈرتے تھے، بلکہ لوگوں کے ابتلا میں پڑنے سے ڈرتے تھے اور یا ہو سکتا ہے کہ جب آپ نے زید کی غلطی کو محسوس کیا ہو اور دیکھا ہو کہ اسے طلاق دینے سے نہیں روکا جا سکتا تو چونکہ آپ نے نکاح خود زور دے کر کرایا تھا اور زینب رضی اللہ عنہا اس معاملہ میں بالکل بے قصور تھیں، اس لیے آپ نے ان کے رنج کا ازالہ اسی میں سمجھا کہ خود زینب سے نکاح کر لیں اور یہ منشا زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی کا پیشتر سے تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ان سے شادی کر لیں۔ مگر اس وقت آپ نے پسند نہ کیا اور زید رضی اللہ عنہ سے اس کا نکاح کرا دیا۔ تو آپ کو یہ خوف ہوا کہ زید کو لوگ آپ کا بیٹا کہتے ہیں اور یہ امر لوگوں کے لیے ابتلا کا موجب ہوگا۔ لیکن انہی الفاظ ﴿ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ﴾ کے متعلق ایک اور قول بھی تفاسیر میں ہے کہ ان میں پہلے الفاظ ﴿ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ ﴾ کی طرح خطاب زید رضی اللہ عنہ کو ہے۔ اور اس قسم کی ترکیب کی صحت کی مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ (ر) اور بظاہر کلام میں تسلسل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گو ﴿ تَخْشَى النَّاسَ ﴾ کی یہ تاویل درست ہے کہ آپ لوگوں کے ابتلا میں پڑنے سے ڈرتے تھے تاہم آگے رسولوں کے متعلق جو الفاظ آتے ہیں ﴿ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ﴾ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ زید کے متعلق ہی ہیں۔ البتہ یہ سوال ہوتا ہے کہ وہ کیا بات تھی جسے زید رضی اللہ عنہ چھپاتے تھے اور لوگوں سے ان کو کیا خوف تھا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ زید رضی اللہ عنہ طلاق دینا چاہتے تھے اور یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ **طلاق دینے میں اگر کوئی قصور تھا تو ان کا تھا نہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا**۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ایک شرف حاصل تھا، وہ

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ نبی پر اس کے بارے میں کوئی مضائقہ نہیں جو اللہ نے

رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں اور معزز سے معزز گھرانے کی بی بی تھیں۔ زید رضی اللہ عنہ نہ صرف ایسے معزز خاندان سے نہ تھے بلکہ غلامی کے داغ کے نیچے بھی رہ چکے تھے۔ ان کو زینب رضی اللہ عنہا کی حرکات وسکنات سے یہ خیال گزرتا ہوگا کہ یہ اپنی بڑائی چاہتی ہے۔ جب بی بی بڑے خاندان کی ہو اور خاوند کی حیثیت ادنیٰ ہو تو خواہ بی بی کی طرف سے کوئی امر اس کی عزت کے خلاف نہ ہو، مگر بی بی کے مرتبہ بلند کی وجہ سے اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ وہ اپنی عزت چاہتی ہے اور اس لیے وہ اس کی مناسب عزت نہیں کرتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زید رضی اللہ عنہ اور زینب رضی اللہ عنہا کے معاملہ نے یہی صورت اختیار کر لی تھی۔ کیونکہ اس کے خلاف صرف یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ زینب رضی اللہ عنہا واقعی ان سے بدسلوکی کرتی ہوں اور قصور ان کا ہو۔ مگر اس کی تردید قرآن کریم کے صریح الفاظ ﴿اتَّقِ اللّٰهَ﴾ سے ہوتی ہے جو قصور زید رضی اللہ عنہ کا بتاتے ہیں۔ پس جو بات زید رضی اللہ عنہ دل میں چھپاتے تھے وہ یہی زینب رضی اللہ عنہا کے مقام بلند اور عظمت کا خیال تھا اور اللہ اسے ظاہر کرنے والا تھا۔ اس لیے کہ ان کو اس سے بڑھ کر مقام ملنے والا تھا یعنی نبی کریم ﷺ کی بیبیوں میں داخل ہونے کا شرف۔ اور ﴿تَخْشَى النَّاسَ﴾ میں بھی یہی اشارہ ہے یعنی زید رضی اللہ عنہ زینب رضی اللہ عنہا کی عزت کرنے میں اس بات سے ڈرتے تھے کہ لوگ کہیں گے یہ عورت کی اتنی عزت کرتا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ﴾ حالانکہ حق یہ تھا کہ انہیں لوگوں کی باتوں کی پروا کیے بغیر جو حقوق بی بی کے ان کے ذمے تھے انہیں مناسب طریق پر ادا کرنا چاہیے تھا۔

آنحضرت ﷺ کے زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کی وجوہات:

زید رضی اللہ عنہ کے طلاق دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے کا حکم دیا اور یہی وہ بات ہے جسے یہاں ﴿زَوَّجْنٰكَهَا﴾ کہا ہے۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح کسی الگ طرز پر ہوا تھا۔ اس نکاح کی ایک غرض تو وہی تھی جسے یہاں بیان کیا ہے کہ منہ بولے بیٹے کی بی بی طلاق یا وفات کے بعد محرمات میں شمار نہ ہو، جیسا عرب میں رواج تھا۔ اور جب تک رسول اللہ ﷺ خود اس رسم کو اپنے عمل سے دور نہ کرتے اس کا دور ہونا مشکل تھا۔ بعض باتوں کے خلاف قومی میلان ایسا ہوتا ہے کہ جب تک کسی بڑے آدمی کو اس کے خلاف کام کرتا نہ دیکھا جائے تعصب دور نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری بڑی بات یہ تھی کہ نبی ﷺ کی ازواج میں جس قدر بیبیاں تھیں وہ سب سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیوہ تھیں۔ لیکن چونکہ آپ کی زندگی میں ہر قسم کے نمونے ہونے ضروری تھے اور منجملہ اور باتوں کے طلاق کے واقعات کا پیش آنا لابدی تھا اور مطلقہ عورت کے نام پر عموماً ایک داغ سا لگ جاتا ہے اس لیے آپ کو یہ حکم ہوا کہ ایک مطلقہ عورت سے نکاح کر کے یہ بھی امت کے لیے نمونہ قائم کریں کہ طلاق حالات انسانی میں بعض وقت عورت کے قصور کے بغیر ناموافقت حالات سے پیش آجاتی ہے اور مطلقہ عورت سے نکاح کرنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ علاوہ ان دو باتوں کے ایک یہ بھی ضرورت تھی کہ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آنحضرت ﷺ نے خود زید رضی اللہ عنہ سے کرایا تھا اور اب جو ایسی طلاق سے جس میں وہ بے قصور تھیں انہیں صدمہ پہنچا۔ اس کا ازالہ سوائے اس کے نہ ہو سکتا تھا کہ جیسا کہ ابتدا میں زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی کا منشا تھا آنحضرت ﷺ خود انہیں اپنے نکاح میں لاتے۔

اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۙ﴿۳۸﴾

اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ یہی اللہ کا قانون ان کے بارے میں ہے جو پہلے گزر چکے۔ اور اللہ کا حکم ایک اندازہ ہے جو ٹھہرایا جا چکا ہے۔ (2657)

آنحضرت ﷺ کے زینب ؓ سے نکاح کے متعلق جھوٹے قصے:

اور جو ایک لغو قصہ یہاں پر بعض مفسرین نے حسب عادت بلا تحقیق لکھ دیا ہے کہ زید رضی اللہ عنہ نے طلاق اس لیے دی تھی کہ آنحضرت ﷺ کا ارادہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ہو گیا تھا۔ اور بعض نے اس پر اور بھی لغو تفصیلات بڑھائی ہیں کہ نبی کریم ﷺ زید رضی اللہ عنہ کی غیر حاضری میں آئے تھے تو آپ نے زینب رضی اللہ عنہا کو بیٹھے ہوئے دیکھا اور زید رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ آپ زینب رضی اللہ عنہا کو چاہتے ہیں تو اس نے طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ ان تمام بیہودہ قصوں کو قرآن کریم کے صریح الفاظ اور واقعات تاریخی باطل کرتے ہیں۔ بھلا اگر نبی ﷺ کا منشا خود نکاح کا ہوتا تو آپ زید رضی اللہ عنہ کو کیوں روکتے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں کے خوف سے روکا تھا تو ساتھ ﴿اتَّقِ اللّٰهَ﴾ کی ہدایت کس طرح موزوں تھی۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ. خلاف تقویٰ کام خود کریں اور زید کو کہیں ﴿اتَّقِ اللّٰهَ﴾۔ کیا ایسے الفاظ قرآن کریم دیکھنے کے بعد زید ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کی بیعت میں رہ سکتا تھا۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم جن کے سامنے یہ واقعہ ہوا وہ کب ایسی بات کو دیکھ کر اپنی جانیں آپ پر فدا کر سکتے تھے؟ اس حال میں کہ اسے خدا کا کلام سمجھتے ہوں۔ اور یہ کس قدر بیہودہ بات ہے کہ نبی ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کو دیکھ لیا تھا۔ زینب رضی اللہ عنہا آپ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں اور ایک دفعہ نہیں ہزاروں دفعہ آپ نے انہیں دیکھا ہوا تھا۔ زینب رضی اللہ عنہا اور ان کا بھائی خود چاہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ ان سے نکاح کر لیں اور آنحضرت ﷺ نے خود انکار کر کے ان کا نکاح زید رضی اللہ عنہ سے کرایا۔ پھر اس سے بڑھ کر جھوٹ کیا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ زینب کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ جسے کنوارپن کی حالت میں قبول نہیں کیا اسے مطلقہ ہونے کی حالت میں اپنے نکاح میں لانا سوائے کسی مجبوری کے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہ وجوہات اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے نفس کی خواہش اگر کوئی تھی تو زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کے خلاف تھی۔ انہی جھوٹے قصوں کی تشہیر کرنے والوں کے متعلق سورت کے آخری رکوع میں یہ لفظ آتے ہیں ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا﴾ [69] یہاں صاف بتا دیا ہے کہ نبی ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ان تمام باتوں سے بری ہیں اور مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ بھی سمجھا دیا کہ غلطی سے ایسی باتیں خود مسلمانوں کے منہ سے نکلیں گی۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا زید رضی اللہ عنہ کے گھر میں ایک سال یا اس سے اوپر رہی ہیں اور طلاق کے بعد عدت بھی گزاری۔ پس [آیت: 36] میں جس میں زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کا ذکر ہے اور اس آیت سے کوئی ڈیڑھ سال کا فرق ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس سورت کا نزول اچھے لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے۔

2657- ﴿قَدَرًا مَّقْدُوْرَا﴾ مَقْدُوْرٌ۔ قَدْرٌ کے بعد تاکید کے لیے ہے جیسے ظِلٌّ ظَلِيْلٌ۔ (ر) یا قَدْرٌ سے اشارہ اس کی طرف ہے جو

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾

وہ لوگ جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوائے کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب لینے والا بس ہے۔ (2658)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ ع

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (2659)

اندازہ خلق اشیاء کا ہو چکا اور مَقْدُوْرٌ سے اشارہ اس کی طرف ہے جو آئندہ مختلف حالات میں اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ (غ)

یہاں آنحضرت ﷺ کے زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کو ﴿فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ﴾ قرار دے کر اور پھر اسے ﴿اَمْرُ اللّٰهِ﴾ کہہ کر بتا دیا کہ یہ نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔

2658- اس آیت میں عام قانون کے رنگ میں صاف بتا دیا کہ نبی کریم ﷺ کو کسی انسان کا خوف نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے سارے معاملات ﴿خَشْيَةَ اللّٰهِ﴾ کو مدنظر رکھ کر ہیں۔

2659- ﴿خَاتَمَ﴾۔ خَتَمَ کے لیے [دیکھو نمبر: 18] اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی چیز کے آخر کو پہنچ گیا۔ اور خَاتَمٌ کے معنی مہر بھی ہیں اور آخر بھی۔ اور کسی قوم کے خَاتَمٌ اور خَاتِمٌ سے مراد ان میں سے آخری ہونا ہے۔ [خِتَامُ الْقَوْمِ وَ خَاتَمُهُمْ وَ خَاتِمُهُمْ اٰخِرُهُمْ] (ل) اور خَاتِمٌ اور خَاتَمٌ ہمارے نبی ﷺ کے اسماء میں سے ہیں اور [خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ] اور [خَاتِمَ النَّبِيِّيْنَ] کے معنی ہیں آخری نبی۔ (ل) اور آپ کو ﴿خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ کہا اس لیے کہ نبوت کو آپ کے ساتھ ختم کر دیا۔ (غ)

خاتم النبیین کی تفسیر احادیث نبوی سے:

﴿خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ کے معنی لغت سے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ایک قوم ہیں اور کسی قوم کا خَاتَمٌ یا خَاتِمٌ ہونا صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی ان میں سے آخری ہونا۔ پس نبیوں کے خاتم کے معنی نبیوں کی مہر نہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔ یہاں ان سب احادیث کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں جن میں [خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ] کی تشریح کی گئی ہے یا جن میں آنحضرت ﷺ کے بعد نبی کا نہ آنا بیان کیا گیا ہے اور یہ احادیث متواترہ ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد نبی نہیں۔ حدیث اول جس میں لفظ [خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ] کی تفسیر زبان نبوی سے مروی ہے۔ متفق علیہ ہے: [إِنَّ مَثَلِي وَمَثَلَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى بَيْتًا فَأَحْسَنَهُ وَأَجْمَلَهُ إِلَّا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کو بہت یاد کرو۔

مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفُونَ بِهِ وَيَعْجَبُونَ لَهُ وَيَقُولُونَ هَلَّا وُضِعَتْ هَذِهِ اللَّبِنَةُ قَالَ فَأَنَا اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتِمُ النَّبِيِّينَ.] (صحيح البخارى، كتاب المناقب، باب خَاتِمِ النَّبِيِّينَ ﷺ: 3535) یعنی میری مثال اور نبیوں کی مثال ایک شخص کی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور اسے اچھا اور خوبصورت بنایا سوائے کونے کی اینٹ کے۔ تو لوگ اس کے گرد گھومتے اور تعجب کرتے اور کہتے یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی۔ سو میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ اور دوسری حدیث متفق علیہ میں لفظ خاتم النبیین کی تفسیریوں کی ہے: [وَإِنَّهُ سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي كَذَّابُونَ ثَلاَثُونَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي.] (سنن أبى داؤد، كتاب الفتن، باب ذِكْرِ الْفِتَنِ وَدَلاَئِلِهَا: 4254) یعنی میری امت میں تیس کذاب ہوں گے ہر ایک ان میں سے دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے اور میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور تیسری حدیث جو مسلم، ترمذی، نسائی کی ہے یہ ذکر ہے کہ مجھے چھ چیزوں میں دوسرے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے۔ جن میں چھٹی یہ ہے کہ [خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ] (صحيح مسلم، كتاب المساجد باب 1: 1195) یعنی ساتھ نبی ختم کیے گئے۔ وہاں بجائے [خَاتَمُ النَّبِيِّينَ] کے یہ لفظ رکھ کر بتادیا کہ خاتم النبیین سے یہی مراد ہے نہ کچھ اور۔ وہ احادیث جن میں آپ کے آخری نبی ہونے کا ذکر ہے اور وہ بھی درحقیقت خاتم النبیین کی تفسیر ہی ہیں بہت سی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل میں نبی کے بعد نبی آتا تھا لیکن میرے بعد نبی نہ آئے گا بلکہ خلفا ہوں گے اور ایک حدیث میں ہے کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔ اور ایک میں ہے کہ علی کی نسبت میرے ساتھ وہی ہے جو ہارون کی موسیٰ کے ساتھ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور ایک میں ہے کہ میرا نام عَاقِبٌ ہے اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو [وَأَنَا الْعَاقِبُ، وَالْعَاقِبُ الَّذِي لَيْسَ بَعْدَهُ نَبِيٌّ] (صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فِي أَسْمَائِهِ ﷺ: 6251)۔ اور ایک میں ہے کہ نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا مگر مبشرات، اور ایک میں ہے کہ نبوت اور رسالت منقطع ہوگئی۔ اور دس حدیثوں میں ہے [لَا نَبِيَّ بَعْدِي] یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں، اور ایسی حدیثیں جن میں آپ کو آخری نبی کہا گیا ہے چھ ہیں۔ اس قدر زبردست شہادت کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا آنحضرت ﷺ کے آخری نبی ہونے سے انکار کرنا بینات اور اصول دینی سے انکار ہے۔

لَوْ عَاشَ اِبْرٰهِيْمُ لَكَانَ نَبِيًّا پر بحث:

اور اس کے خلاف جو کچھ احادیث میں سمجھا گیا ہے وہ ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے [لَوْ عَاشَ إِبْرَاهِيمُ لَكَانَ نَبِيًّا] مگر اول اس سے امکان نبوت نہیں نکلتا بلکہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبيآء: 22:21] ''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوائے (کوئی اور) معبود ہوتا تو دونوں بگڑ جاتے۔'' جس طرح یہاں دو خداؤں کا ہونا اور فساد

وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ اور صبح اور شام اس کی تسبیح کرو۔

دونوں ممتنع امر ہیں، اسی طرح وہاں ابراہیم کا زندہ رہنا اور اس کا نبی ہونا دونوں ممتنع امر ہیں۔ دوسرے اس حدیث کی سند میں ضعف ہے، کیونکہ اس میں ابوشیبہ ابراہیم ہے جسے ضعیف کہا گیا ہے۔ تیسرے اس کی تشریح دوسرے اقوال سے ہوتی ہے۔ مثلاً بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کا قول [وَلَوْ قُضِيَ أَنْ يَكُونَ بَعْدَ مُحَمَّدٍ ﷺ نَبِيٌّ عَاشَ ابْنُهُ، وَلٰكِنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ.] (صحيح البخاری، كتاب الأدب، باب مَنْ سَمَّى بِأَسْمَاءِ الأَنْبِيَاءِ: 6194) یعنی اگر آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی مقدر ہوتا تو آپ کا بیٹا ابراہیم زندہ رہتا، لیکن آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ یا انس کا قول [وَلَوْ بَقِيَ لَكَانَ نَبِيًّا لٰكِنْ يَبْقَ لِاَنَّ نَبِيَّكُمْ اٰخِرِ الْاَنْبِيَآءِ] یعنی اگر ابراہیم زندہ رہتا تو نبی ہوتا لیکن وہ باقی نہیں رہا کیونکہ تمہارے نبی آخری نبی ہیں۔

اور ایک قول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا پیش کیا جاتا ہے جس کی کوئی سند نہیں۔ [قُولُوا: خَاتَمُ النَّبِيِّينَ، وَلَا تَقُولُوا: لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ] خاتم النبیین کہو اور یہ نہ کہو کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک [خَاتَمُ النَّبِيِّينَ] کے معنی کچھ اور تھے۔ کاش وہ معنی بھی کہیں مذکور ہوتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اپنے قول میں ہوتے، کسی صحابی کے قول میں ہوتے، نبی کریم ﷺ کی حدیث میں ہوتے، مگر وہ معنی دربطن قائل ہیں۔ اور اس قدر حدیثوں کی شہادت جن میں [خَاتَمُ النَّبِيِّينَ] کے معنی [لَا نَبِيَّ بَعْدِی] کیے گئے ہیں ایک بے سند قول پر پس پشت پھینکی جاتی ہیں۔ یہ غرض پرستی ہے خدا پرستی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تیس حدیثوں کی شہادت ایک بے سند قول کے سامنے رد کی جاتی ہے۔ اگر اس قول کو صحیح مانا جائے تو کیوں اس کے معنی یہ نہ کیے جائیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مطلب یہ تھا کہ دونوں باتیں اکٹھی کہنے کی ضرورت نہیں [خَاتَمُ النَّبِيِّينَ] کافی ہے۔ جیسا کہ مغیرہ بن شعبہ کا قول ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے کہا [خَاتَمُ الأَنْبِيَاءِ، لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ] (مصنف ابن أبی شيبة، جلد9، صفحہ 110) تو آپ نے کہا [خَاتَمُ الأَنْبِيَاءِ] کہنا تجھے بس ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا مطلب ہو کہ جب اصل الفاظ [خَاتَمُ النَّبِيِّينَ] واضح ہیں تو وہی استعمال کرو یعنی الفاظ قرآنی کو الفاظ حدیث پر ترجیح دو۔ اس سے یہ کہاں نکلا کہ آپ الفاظ حدیث کو صحیح نہ سمجھتی تھیں اور اتنی حدیثوں کے مقابل اگر ایک حدیث ہوتی تو وہ بھی نا قابل قبول نہ ہوتی، چہ جائیکہ صحابی کا قول جو شرعاً حجت نہیں۔

ختم نبوت اور نزول عیسیٰؑ:

اور یہ خیال جو لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی اللہ آنحضرت ﷺ کے بعد واپس آئیں گے یہ بھی اس نص صریح کے خلاف ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک روشن چراغ تھے جنہوں نے ایک ضرورت کے وقت صرف بنی اسرائیل کے ایک گھرانے کو روشن کیا ﴿رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ محمد رسول اللہ ﷺ آفتاب عالمتاب ہیں ﴿وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾۔ آفتاب کے نکل آنے کے بعد چراغ روشن نہیں ہوا کرتے۔ یہ فعل تو انسان بھی نہیں کرتا، خدائے حکیم کی طرف کیونکر منسوب ہوسکتا ہے۔ پھر اگر حضرت

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىٕكَتُهٗ وہی ہے جو تم پر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی،
لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ تا کہ تمہیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالے۔

عیسیٰ علیہ السلام آ جائیں تو ختم نبوت باطل ہوئی۔ کیونکہ نبی تو نبوت سے معزول نہیں ہوسکتا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے نبی ہو کر ہی آئیں گے اور یہ کہنا کہ نبی تو ہوں گے مگر کام نبوت کا نہیں کریں گے، اور بھی عجیب بات ہے۔ وہ خدا بھی عجیب ہے کہ ایک نبی کو بھیجتا ہے مگر کام نبوت کا اس سے کچھ نہیں لیتا۔ اور پھر عملاً یہ عہدہ نبوت سے معزولی ہے۔ سوال صاف ہے اگر ختم نبوت ایک فرضی شے ہے تو چاہے ہزاروں نبی آئیں اور اگر یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کا کام آنحضرت ﷺ کے بعد باقی نہیں رہا اور تکمیل کو پہنچ گیا تو جیسے نیا نبی نہیں آ سکتا پرانا بھی نہیں آ سکتا۔ اور احادیث میں جو عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے آنے کا ذکر ہے تو اس سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوسکتی کہ ایک عیسیٰ صفت انسان اس امت میں بھی پیدا ہوگا اور انہی حالات کے ماتحت پیدا ہوگا جن حالات کے ماتحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں آئے تھے۔

اس آیت کا یہاں کیا تعلق ہے؟ اصل مضمون تو آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہونا تھا اور یہ کہ مومن کا تعلق آپ سے روحانی تعلق ہے اور **آپ مومنوں کے لیے روحانی طور پر باپ ہیں**۔ اسی مضمون کو یہاں ادا کیا ہے اور بتایا ہے کہ محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن چونکہ اس سے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی ابوت کی نفی کا اشتباہ پیدا ہوتا تھا اس لیے حرف استدراک ﴿لٰكِنْ﴾ سے فی الفور اس کا ازالہ کیا اور فرمایا ﴿رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ وہ اللہ کے رسول ہیں، یعنی روحانی طور پر تمہارے باپ ہیں۔ کیونکہ ہر ایک رسول اپنی امت کے حق میں روحانی طور پر باپ کا حکم رکھتا ہے۔ جس طرح جسم کی ابتدا باپ سے ہوتی ہے روحانیت کی ابتدا رسول سے ہوتی ہے۔ پس ﴿رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ کا لفظ لا کر آپ کی ابوت روحانی کو قائم کیا۔ لیکن یہاں پھر ایک وہم پیدا ہوتا تھا کہ جس طرح پہلے رسولوں کے بعد دوسرے آجاتے رہے تو پہلے رسولوں کی ابوت روحانی منقطع ہوجاتی رہی۔ کیا اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوگا؟ تو فرمایا ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ آپ [خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ] بھی ہیں یعنی آخری نبی، اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اس لیے آپؐ کی ابوت روحانی کا سلسلہ بھی تا قیامت منقطع نہ ہوگا بلکہ جو فیض ملے گا وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ سے ہی ملے گا اور اسی فیض کے پانے سے ہی آپ کی امت کے لوگ مثیل انبیاء ہوں گے۔ [عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَاءِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ] وہ نبی نہ ہوں گے پر نبیوں کی طرح ہوں گے۔ وہ نبی نہ ہوں گے پر اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوگا [رِجَالٌ يُكَلَّمُونَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ] (صحيح البخاری، كتاب فضائل الصحابة، باب مَنَاقِبُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَبِي حَفْصٍ الْقُرَشِيِّ الْعَدَوِيِّ رضی الله عنه: 3689) اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام معطل نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم کی دلیل ہے کہ تمام دنیا کی ضروریات مذہبی کے متعلق مکمل ہدایات رسول اللہ ﷺ پر نازل فرما دیں۔ اسی لیے آیت کا خاتمہ ﴿بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ پر کیا ہے۔ ہدایات دینی مکمل ہوگئیں لیکن تعلق باللہ ختم نہیں ہوا بلکہ ان ہدایات کی بدولت پہلے سے بھی بڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔

وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾

اور وہ مومنوں پر رحم کرنے والا ہے۔ (2660)

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾

ان کی دعائے ملاقات جس دن وہ اس سے ملیں گے سلامتی ہوگی اور ان کے لیے عزت والا اجر تیار کیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾

اے نبی! ہم نے تجھے گواہ بنا کر بھیجا ہے اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا۔

وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا سورج۔ (2661)

2660- ﴿يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ﴾ اللہ کی صلوٰۃ سے مراد تزکیہ یا گناہوں سے پاک کرنا ہے [دیکھو نمبر: 196] اور ملائکہ کی صلوٰۃ استغفار ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ صلوٰۃ اللہ کی طرف سے رحمت ہے اور فرشتوں کی طرف سے استغفار یعنی حفاظت الٰہی کا طلب کرنا اور انسانوں کی طرف سے دعا۔ (ر) اور **اللہ اور ملائکہ کی صلوٰۃ کا اکٹھا ذکر** اس لیے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تزکیہ ملائکہ کی وساطت سے ہوتا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو گناہوں کی ظلمت سے نکالے تو ملائکہ اس کے دل میں نیکی کی تحریک کرتے ہیں، گو اس رکوع میں ذکر آنحضرت ﷺ کی ازواج کا ہی ہے مگر اصل مضمون کی طرف ابتدائے رکوع میں پھر توجہ دلائی ہے اور مومنوں کا تزکیہ ہے جو غرض و غایت نبوت ہے۔

2661- یہاں آنحضرت ﷺ کے متعلق پانچ باتیں بیان کی ہیں۔ شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، سراج منیر۔ **شاھد نبی کو کن معنوں میں کہا جاتا ہے؟** [دیکھو نمبر: 1451] وہ اس تعلیم کے عملی گواہ ہوتے ہیں جو وہ دوسروں کے لیے لاتے ہیں اور اسی کے قریب قریب ہے جو کہا گیا ہے [شَاهِدًا بِاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ] گویا وہ حق پرست ہے۔ پھر وہ اہل حق کو بشارت دیتا ہے، اہل باطل کو بد انجام سے ڈراتا ہے، پھر وہ حق کی طرف بلاتا ہے اور یہی نبی کا اصل کام ہے یعنی انسان کو اللہ کی طرف بلانا یا انہیں باخدا بنانا۔ پھر وہ سورج کی طرح روشنی بھی دیتا ہے تاکہ دوسرے اس کی روشنی سے فائدہ اٹھائیں اور اندھیرے سے باہر نکلیں۔ آپ کو سِرَاجٌ کہنے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ اس آفتاب عالمتاب کے طلوع کے بعد ان روشنیوں کی ضرورت نہیں رہی جو پہلے مختلف قوموں کو اور مختلف ملکوں کو روشن کیا کرتی تھیں۔ نبوت کے چراغ اپنا اپنا کام ایک اندھیری رات میں دے چکے۔ طلوع آفتاب کے بعد اب کسی چراغ کی ضرورت نہیں رہی۔ [لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَعِيسٰى حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا إِلَّا اتِّبَاعِي] (تفسیر ابن کثیر، جلد2، صفحہ 68) اگر موسیٰ اور عیسیٰ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو انہیں اسی آفتاب سے روشنی حاصل کرنی ہوتی۔ جو

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾

اور مومنوں کو بشارت دے کہ ان کے لیے اللہ کا بڑا فضل ہے۔

وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ دَعْ اَذٰىهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مان اور ان کے ایذا دینے کی پروانہ کر اور اللہ پر بھروسا کر اور اللہ کارساز بس ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر تم انہیں طلاق دے دو قبل اس کے کہ تم انہیں چھوؤ تو تمہارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرو، سو انہیں سامان دو اور انہیں خوبی کے ساتھ رخصت کر دو۔ (2662)

کوئی اپنے شیشہ دل کو صاف کر کے اس آفتاب کے سامنے آتا ہے اس کے اندر **اس آفتاب کا نور منعکس ہو جاتا ہے یہی ظلی نبوت ہے جسے ولایت کہا جاتا ہے یعنی کامل اتباع پر انوار نبوت کا کسی سینہ میں منعکس ہو جانا**۔ اور ازواج مطہرات کے مضمون سے پہلے اس مضمون کا بیان بتاتا ہے کہ اصل غرض نبی کی زندگی کی کیا ہے اور یہ سارے سامان محض اسی غرض کے حصول کے لیے ہیں۔

2662- اس آیت کو اس مضمون کے اندر بالکل بے تعلق خیال کیا گیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی ازواج کا ذکر تھا اور ان کے مطالبہ کا کہ انہیں بھی مال دنیا سے حصہ دیا جائے۔ جس پر حکم ہوا تھا کہ اگر دنیا کی زندگی اور اس کا سامان کثیر مدنظر ہے تو تمہیں طلاق دے کر اور سامان دنیا سے حصہ دے کر رخصت کر دیا جائے گا۔ درمیان میں اور کئی باتوں کا ذکر کر کے اب مضمون کو پھر ازواج مطہرات کے مضمون کی طرف لوٹایا ہے اور یہ آیت اسی تعلق کو قائم کرنے کے لیے ہے۔ ابھی ذکر مومنوں کے اتباع نبوی کا تھا تو چونکہ **طلاق کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ کی ازواج کے لیے متاع دینے** اور اچھی طرح رخصت کرنے کا حکم تھا اس لیے اب فرمایا کہ اس میں بھی مومنوں کے لیے نبی کریم ﷺ اسوۂ حسنہ ہیں۔ پس وہ حکم نبی اور اس کی ازواج سے مخصوص نہیں۔ بلکہ جب کسی مومن عورت کو طلاق دی جائے تو اسے اسی طرح متاع دینا اور خوبی کے ساتھ رخصت کرنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر بی بی کو اس کے ساتھ تعلق پیدا ہونے سے پیشتر بھی طلاق دی جائے تو بھی یہی حکم ہے۔ اور عدت کا حکم ضمناً آ گیا ہے، یہ بتانے کے لیے کہ جب میاں بیوی والا تعلق نہیں ہوا تو عدت بھی کوئی نہیں۔ خلوت صحیحہ سے مساس لازم نہیں آتا اور **جب تک**

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ
الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ
يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ
عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ
خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَ امْرَاَةً
مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ
النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ
دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا
عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ
وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰

اے نبی! ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیویاں جائز کر دی ہیں جنہیں تو نے ان کے مہر دے دیئے ہیں اور جس کا تیرا دایاں ہاتھ مالک ہوا۔ اس سے جو اللہ نے تجھے (کفار سے) دلایا۔ اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموؤں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی۔ اور مومن عورت اگر وہ اپنے تئیں نبی کو بخش دے اگر نبی چاہے کہ اس سے نکاح کرے یہ خاص تیرے لیے ہے۔ مومنوں کے لیے نہیں۔ ہم جانتے ہیں جو ہم نے ان کے لیے ان کی بیویوں کے اور ان کے بارے میں جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہوئے فرض کیا ہے تاکہ تجھ پر تنگی نہ ہو اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2663)

مساس نہ ہو عدت نہیں۔

2663- **آنحضرت ﷺ کو چار ازواج کی حد بندی سے مستثنیٰ کرنا اور اس کی وجہ:** اس آیت میں آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ہم نے تیری وہ بیبیاں تیرے لیے جائز کی ہیں جن کے مہر تو نے دیئے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ بیبیاں پہلے ہی آنحضرت ﷺ کے لیے جائز تھیں۔ تو اس حکم کی ضرورت کیا پیش آئی؟ اس کی وجہ سورۂ النسا کا وہ حکم ہے جس کی رو سے تعدد ازواج کی اجازت کو چار تک محدود کیا گیا اور ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ﴾ میں اس کی طرف اشارہ بھی ہے۔ پس مطلب اس کا یہ ہے کہ جہاں اور لوگوں کو جن کے پاس اس حکم کے نزول کے وقت چار سے زیادہ بیبیاں تھیں، چار کو رکھ کر باقی کو رخصت کر دینے کا حکم ہوا۔ نبی ﷺ کو اجازت دی گئی کہ جس قدر ازواج آپ کے نکاح میں تھیں خواہ ان کی تعداد چار سے زیادہ ہو وہ سب آپ کے لیے جائز ہیں۔ اس فرق کی وجہ سوائے اس کے کوئی نہیں ہو سکتی کہ آپ کے نکاحوں کی غرض صرف تعلقات زوجیت نہیں بلکہ دینی غرض تھی۔ قرآن کریم کے جس قدر احکام ہیں ان کو دیکھا جائے تو نبی کریم ﷺ ان کے سب سے پہلے عامل ہیں۔ بالخصوص وہ باتیں جن کا تعلق ترک آسائش سے ہے، ان پر جس حد

تک نبی ﷺ نے عمل کر کے دکھایا عام مومن اس حد تک نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً اگر اوروں کو مال کی زکوٰۃ دینے کا حکم ہے تو آپ نے اپنے پاس کبھی کوئی مال رکھا ہی نہیں بلکہ جس قدر آیا وہ فوراً دے دیا۔ اور اگر اوروں کو پانچ نمازوں کا حکم ہے تو آپ کو اس کے ساتھ تہجد کی نماز کا بھی حکم ہے اور رات کو بیدار رہنے کا حکم ہے۔ اگر اوروں کو حفاظت دین کے لیے جنگ کا حکم ہے تو یہ حکم سب سے پہلے آپ پر عائد ہوتا ہے، بلکہ حقیقی مکلف اس کی آپؐ کی ذات بابرکات ہی ہے ﴿لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ﴾ [النسآء: 84:4] ''تجھے اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لیے مکلف نہیں کیا جاتا'' اگر اور مسلمانوں کے گھر میں کچھ نہ کچھ سامان آسائش ہے اور ان کی بیبیوں کے پاس کچھ نہ کچھ زینت و آرائش کا سامان ہے تو آپ کے لیے یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ پس آپ کے ازواج کی غرض محض زن و شوہر کا تعلق ہوتا تو یقیناً آپ نہ صرف فوراً چار کی حد بندی پر عامل ہوتے بلکہ چار تک کی اجازت کو بھی اپنے لیے غیر ضروری سمجھتے۔ اور جس طرح تر پچپن سال کی عمر تک ایک ہی بی بی پر اکتفا کیا تھا، اب بڑھاپے میں بھی ایک ہی پر اکتفا کرتے۔ خصوصاً جب کہ اس ایک یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ کی محبت بھی کمال کو پہنچی ہوئی تھی، مگر ایسا نہ ہوا۔ اس لیے کہ اس تعلق زوجیت کی غرض دینی تھی۔ پس سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ جس قدر بیبیاں تمہارے نکاح میں اس وقت ہیں جنہیں تم نے ان کے مہر بھی دیئے ہیں وہ سب تمہارے لیے حلال ہیں۔

دوم ان عورتوں کو آپ کے لیے جائز قرار دیا ﴿مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ﴾ فَیٔ کے لیے [دیکھو نمبر: 289] اچھی حالت کی طرف لوٹ کر آنا اور اس لیے اس مال غنیمت کو جس میں مشقت نہ ہو فَیٔ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَفَاءٌ ہے۔ (غ) اور غنیمت اور خراج کو بھی فَیٔ کہا جاتا ہے اور اس مال کو بھی جو بلا قتال دشمن سے ہاتھ آئے۔ (ل) پس ﴿مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ﴾ سے مراد وہ بیبیاں ہیں جو دشمن قوم میں سے آئیں اور ﴿مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ﴾ ساتھ اس لیے بڑھایا کہ پھر وہ جائز طور پر آپؐ کے نکاح میں آئیں۔ اس میں نبی کریم ﷺ کے نکاحوں کی ایک غرض بتائی ہے کیونکہ **دشمن قوم سے کسی بی بی کا نکاح میں لانا** اسی غرض کے لیے ہوسکتا ہے کہ دوسری قوم کے ساتھ اتحاد پیدا کیا جائے اور عداوت کی جڑ کاٹی جائے۔ ایسے دو نکاح آپ کے ثابت ہیں۔ ایک حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو قوم یہود میں سے تھیں اور جن کے ساتھ آپ نے یہ رابطۂ اتحاد پیدا کر کے ان کی دشمنی کا خاتمہ کرنا چاہا، مگر یہ سخت دل قوم عداوت سے باز نہ آئی۔ دوسرا حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو بنی المصطلق میں سے تھیں اور ان کے رئیس حارث کی بیٹی تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی مصطلق کے کوئی سو گھرانوں کے قیدی مسلمانوں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیئے کہ جس خاندان میں رسول اللہ ﷺ نے شادی کی ہے وہ غلام نہیں ہوسکتا۔ اور ایک معمولی قبطی عورت ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنی ازواج میں داخل کر کے آنحضرت ﷺ نے اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دیا اور مسلمانوں کو دوسری قوموں کا احترام سکھایا۔

تیسری قسم کی عورتیں جن کا یہاں ذکر کیا ہے آپ کی قریبی تعلقات والی ہیں۔ چچا اور پھوپھی اور ماموں اور خالہ کی بیٹیاں، جن سے یہاں توسیع کے طور پر دو اول الذکر سے قریشی بیبیاں اور دو مؤخر الذکر سے بنی زہرہ مراد لیے گئے ہیں، جن کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے کہ وہ ایسی عورتیں ہوں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہجرت بھی کی ہے اور بعض نے ہجرت سے مراد اسلام لانا لیا ہے۔ مگر حق یہی ہے کہ یہ الفاظ اپنی اصلیت پر ہیں اور ان تعلقات تک آپ کے ازدواج کو اس لیے محدود کیا ہے کہ ان کی خبر گیری آپ کے ذمہ تھی اور اسی لیے ہجرت بھی ساتھ شرط رکھی۔ گویا دوسرے رشتہ داروں سے ان کا قطع تعلق ہو چکا تھا۔ اس

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُؕ وَ مَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا

(تجھے اختیار ہے کہ) ان میں سے جسے چاہے پیچھے رکھے اور جسے چاہے اپنے پاس جگہ دے اور جسے تو ان میں سے

سے معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں **آپؐ کے نکاح کی غرض ان بیکس بیبیوں کو پناہ میں لینا بھی تھا** جنہوں نے آپ کے ساتھ تکلیفیں اٹھائیں اور ان کو ازدواج میں لینا اخلاقی فرض اس لیے بھی ہو گیا تھا کہ جنگوں کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم رہ گئی تھی۔ عَمّ اور خَالْ کے محدود معنوں میں ایسی کوئی بی بی آپ کی زوجیت میں نہ تھیں۔ البتہ قرشیات میں سے چھ بیبیاں آپ کے نکاح میں آئی تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو فوت ہو چکی تھیں، عائشہ رضی اللہ عنہا، سودہ رضی اللہ عنہا (جن سے مکہ میں ہی نکاح ہو چکا تھا)، حفصہ رضی اللہ عنہا، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔ مؤخر الذکر چاروں بیوہ تھیں اور ان کا نکاح میں لینا محض ان کی خبر گیری کے لیے تھا۔

چوتھی قسم کی وہ عورتیں ہیں جو خود نبی ﷺ سے خواہش نکاح کریں۔ جب نبی کے گھر کو دنیا کے سامانوں اور اس کی زیبتوں سے پاک کر دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ نبی کی بی بی وہی ہو سکتی ہے جو دنیا پر دار آخرت کو ترجیح دے اور آپ کے اقوال و افعال کو محفوظ رکھ کر دوسروں تک پہنچائے، تو ظاہر ہے کہ یہ اجازت محض اسی لیے تھی کہ اگر کسی بی بی کے دل میں یہ تڑپ ہو تو اس کے لیے یہ دروازہ بند نہ ہو، بشرطیکہ نبی ﷺ بھی اسے اس بات کا اہل سمجھیں۔ ایسی کسی بی بی کے آپ کے نکاح میں ہونے سے بعض لوگوں نے مطلقاً انکار کیا ہے۔ بعض نے کہا میمونہ رضی اللہ عنہا بنت الحارث تھیں، بعض نے کہا زینب رضی اللہ عنہا بنت خزیمہ جو ام المساکین کے نام سے مشہور ہیں۔

ازواج مطہرات کی زوجیت آنحضرت ﷺ میں آنے کی تاریخیں:

ایک اور سوال یہ ہے کہ یہ آیت کب نازل ہوئی؟ نبی کریم ﷺ کے نکاح میں جس قدر بیبیاں آئیں وہ سب 7 ہجری تک آ چکی تھیں یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا و سودہ رضی اللہ عنہا مکہ میں، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا جنگ بدر میں بیوہ ہونے کے بعد یعنی 3 ہجری میں، زینب رضی اللہ عنہا بنت خزیمہ جنگ احد میں بیوہ ہونے کے بعد 3 ہجری میں، ام سلمہؓ 4 ہجری میں بیوہ ہونے کے بعد، حضرت زینبؓ 5 ہجری میں مطلقہ ہونے کے بعد۔ جویریہؓ 5 ہجری میں غزوۂ بنی مصطلق میں بیوہ ہو کر، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حبش میں غالباً 5 یا 6 ہجری میں بیوہ ہو کر (ان کا نکاح حبش میں ہوا اور 7 ہجری کے شروع میں وہ مدینہ پہنچ گئیں)، صفیہ رضی اللہ عنہا، 7 ہجری میں غزوۂ خیبر میں بیوہ ہونے کے بعد، ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا، 7 ہجری میں، میمونہ رضی اللہ عنہا بنت الحارث 7 ہجری میں۔ اب سورۂ احزاب کا نزول غزوۂ احزاب کے بعد کا ہے یعنی 5 ہجری کے بعد کا۔ سوۂ نساء کی آیت تعدد ازواج جس کا یہاں حوالہ ہے اس کے متعلق یقیناً کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا نزول 5 ہجری کے بعد کا ہے۔ اب اگر اس آیت زیر بحث کا نزول 7 ہجری سے پہلے کا مانا جائے تو غالباً بعض نکاح نبی کریم ﷺ کے اس آیت کے نزول کے بعد ہوئے اور وہ یا ﴿مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ﴾ میں آتے ہیں۔ جیسے جویریہ رضی اللہ عنہا، صفیہ رضی اللہ عنہا اور ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا اور یا ﴿امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ﴾ میں جیسے میمونہ رضی اللہ عنہا۔ تو گویا نبی ﷺ کے نکاحوں پر حد بندی اس آیت کی رو سے کی گئی وہ یہ تھی کہ خاص خاص عورتوں سے آپ کو نکاح کی

جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَ لَا يَحْزَنَّ وَ يَرْضَيْنَ بِمَآ

چاہے جن سے تو نے علیحدگی اختیار کی تھی تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں یہ بہت قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی

اجازت تھی، جن میں کوئی نہ کوئی غرض دینی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے ﴿لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ﴾ میں یعنی امور دینی میں تنگی نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ مومنوں پر ازدواج کے بارہ میں تنگی ہو اور نبی پر نہ ہو بلکہ نبی کے لیے ایک ضرورت تھی جو مومنوں کے لیے نہ تھی۔ اس لیے فرمایا کہ تا تجھ پر اس ضرورت دینی میں تنگی نہ ہو۔ اور ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا﴾ میں اشارہ تعدد ازواج کی چار تک حد بندی کی طرف ہی ہے اور اگر اس آیت کا نزول 7 ہجری کے بعد کا ہو تو ﴿مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ﴾ وغیرہ میں عطف خاص علی العام ہوگا کیونکہ خواہ کوئی دشمن قوم سے تھیں یا قریشیوں میں سے یا غیر قریشی عرب میں سے یا کسی بیرونی قوم سے، سب امہات المومنین ہونے میں اور ازواج مطہرات ہونے میں یکساں شامل تھیں۔

آنحضرت ﷺ کی بیبیوں کی کثرت پر عیسائیوں کو بڑا اعتراض ہے۔ گو ان کے اپنے پیغمبروں میں بعض کی بیبیوں کی تعداد سو تک یا اس سے بھی زیادہ پہنچ گئی اور گو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر جس قدر بڑے بڑے نبیوں کا ذکر توریت میں ہے وہ سب ہی تعدد ازدواج پر عامل تھے۔ رہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سو ان کا نمونہ ایک بی بی کا بھی نہیں، بلکہ ان کے اس نمونہ پر عمل کیا جائے جو اناجیل میں مذکور ہے تو دنیا کا ہی خاتمہ ہو جائے۔ قرآن کریم نے کھول کر بتا دیا کہ نبی ﷺ کی غرض ان بیبیوں کو زوجیت میں لانے کی حظ نفس نہیں کیونکہ اگر حظ نفس غرض ہوتی تو ان بیبیوں کے لیے خوب سامان آرائش بھی مہیا کرتے۔ مگر وہاں معمولی مسلمانوں کے گھروں میں جو آسودگی تھی وہ بھی میسر نہ آئی۔ علاوہ ازیں غور کیا جائے تو آنحضرت ﷺ کے کل کے کل نکاح سوائے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور سودہ رضی اللہ عنہا کے صرف چار پانچ سال کے اندر محدود ہیں یعنی 3 ہجری سے لے کر 7 ہجری تک۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب اسلام کے خلاف چاروں طرف جنگ و جدال کا سلسلہ جاری ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگوں کی مشکلات کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم ہو جانے سے اور عورتوں کی تعداد بڑھ جانے سے بھی یہ ضرورت پیش آئی تھی کہ ایک ایک مرد کئی کئی بیبیوں کا متکفل ہو۔ اسلامی سوسائٹی بغیر اس کے پاک نہ رہ سکتی تھی۔ وہ لوگ جو سیہ دلی سے شہوانی اغراض کو ان شادیوں کا اصل محرک بتاتے ہیں وہ تاریخ کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ جو شخص 25 سال کی عمر تک تجرد میں رہ کر اور 53 سال کی عمر تک ایک بی بی پر اکتفا کر کے اپنی زندگی کی پاکیزگی اور اپنی عصمت کا بین ثبوت دے دیتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ اسے کس **قدر حکومت اپنے قوائے شہوانی پر حاصل ہے** وہ بڑھاپے کی حالت میں قوائے شہوانی کا غلام نہیں ہوسکتا۔ قوائے شہوانی کی غلامی کا وقت نوجوانی تک ہے، بڑھاپے میں تو خود وہ قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ ہاں بڑھاپے میں دس بیبیوں کے حقوق ادا کر کے محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ بین ثبوت بھی دے دیا کہ وہ قوائے شہوانی جن پر آپ نے جوانی میں حکمرانی کی کس قدر زبردست تھے۔ ہاں آپ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ **حالت تجرد میں پاکیزگی** اور قوائے شہوانی پر حکمرانی کا، پھر ایک لمبے زمانہ تک ایک بی بی سے اعلیٰ درجہ کے تعلق محبت کا، پھر بوقت ضرورت تعدد ازواج کا بھی نمونہ دکھائیں گے۔ اگر یہ سب نمونے

اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝۵۱

رہیں اور غمگین نہ ہوں اور سب کی سب اس پر راضی رہیں جو تو انہیں دے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ جاننے والا بردبار ہے۔ (2664)

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَ كَانَ

(اس کے) بعد تیرے لیے (اور) عورتیں (نکاح میں لانا) جائز نہیں اور نہ یہ کہ تو ان کی جگہ دوسری بیویاں بدل لے خواہ ان کا حسن تجھے اچھا لگے۔ مگر جس کا تیرا دایاں

آپ کی زندگی میں نہ ہوتے تو آپ بھی لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ نہ ہو سکتے تھے۔

2664- **واقعہ ایلاء اور نبی ﷺ کو طلاق کا اختیار دیا جانا:** اس آیت کے متعلق کئی اقوال ہیں۔ بخاری میں خود حضرت عائشہ ﷺ سے دو مختلف باتیں مروی ہیں۔ اول یہ کہ اس میں ان عورتوں کا ذکر ہے جو اپنے آپ کو نبی ﷺ کے نکاح کے لیے پیش کرتی تھیں۔ گویا اس سے مراد ہے کہ ایسی عورتوں میں سے جس کو چاہو نکاح میں لے لو اور جسے چاہو انکار کر دو۔ اور دوسرا یہ کہ اس کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ اگر ایک بی بی کی باری میں دوسری بی بی کے پاس جانا چاہتے تو اس سے دریافت کر لیا کرتے۔ گویا اس آیت میں آپ کو بتا دیا گیا کہ باری مقرر کرنے میں آپ مجبور نہیں۔ قول اوّل اس لیے قابل قبول نہیں کہ جہاں ﴿وَّهَبَتْ نَفْسَهَا﴾ فرمایا وہی ساتھ شرط لگا دی تھی ﴿اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا﴾ یعنی اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے تو کرے، اس لیے دوبارہ ان الفاظ کی ضرورت نہ تھی۔ اور سیدنا ابن عباس ؓ اور حسن کا ایک قول ہے کہ اس سے مراد ہے جسے چاہے طلاق دے اور جسے چاہے اپنے پاس رکھے۔ (ر) اور ابن زید کا قول ہے کہ یہ واقعہ ایلاء کے متعلق ہے یعنی جب نبی ﷺ نے ایک ماہ کے لیے اپنی بیبیوں سے علیحدگی اختیار کی۔ (ج) گویا ایک طرف بیبیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو مال لے کر رخصت ہو جائیں اور چاہیں تنگی کی حالت میں نبی ﷺ کے گھر میں رہیں۔ اور دوسری طرف آپ کو بھی اختیار دیا گیا کہ جسے چاہیں رکھیں اور جسے چاہیں طلاق دیں۔ اور ﴿مِمَّنْ عَزَلْتَ﴾ میں بھی اس علیحدگی کی طرف اشارہ ہے اور اِبْتَغَاءٌ سے مراد اس بی بی کو اپنے پاس جگہ دینا ہے اور اس کا دوبارہ ذکر اس لیے کیا کہ اسی کی سفارش خاص طور پر کی ہے جیسا کہ ﴿ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ﴾ سے ظاہر ہے۔ یعنی تمہارا انہیں اپنے پاس رکھنا ہی ان کی راحت کا موجب ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ جب انہیں اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو نبی کے گھر میں رہیں اور چاہیں طلاق لے لیں۔ اور ایسا ہی اختیار نبی کو دیا گیا کہ جسے چاہیں رکھیں اور جسے چاہیں طلاق دیں۔ تو جب بیبیوں نے نبی کے گھر کو سب دنیا کی آسائشوں پر ترجیح دی تو آنحضرت ﷺ کو بھی یہی حکم دیا گیا کہ سب کو اپنے پاس رکھیں اور آپ نے ایسا ہی کیا یعنی کسی کو طلاق نہ دی۔

ع 6 12 3 اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ رَّقِیۡبًا ﴿۵۲﴾ ع

ہاتھ مالک ہو چکا، اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔(2665)

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَکُمۡ اِلٰی طَعَامٍ غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىہُ ۙ وَ لٰکِنۡ اِذَا دُعِیۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَ لَا مُسۡتَاۡنِسِیۡنَ لِحَدِیۡثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ فَیَسۡتَحۡیٖ مِنۡکُمۡ ۫ وَ اللّٰہُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ؕ وَ اِذَا سَاَلۡتُمُوۡھُنَّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو سوائے اس کے کہ تمہیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے (مگر) اس کے بھی پکنے کا انتظار کرنے والے نہ ہو۔ بلکہ جب تمہیں بلایا جائے تو داخل ہو، پھر جب تم کھانا کھالو تو متفرق ہو جاؤ اور باتوں میں نہ لگ جاؤ۔ یہ بات نبی کو تکلیف دیتی ہے مگر وہ تم سے حیا کرتا ہے اور اللہ حق بات سے شرم نہیں کرتا۔(2666) اور جب تم ان

2665- **آنحضرت ﷺ کا اور نکاحوں سے روکا جانا:** سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہے کہ نبی ﷺ کو ان بیبیوں کے بعد اور بیبیوں سے روک دیا گیا۔ (ج) یعنی جب آپ کی بیبیوں نے مال دنیا کے خیال کو ترک کر کے نبی ﷺ کی رفاقت کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آئندہ اور نکاح کرنے سے روک دیا اور یہی عکرمہ رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے (ر) اور یہی صحیح ہے۔ لکھا ہے کہ اس وقت نو بیبیاں آپ کے نکاح میں تھیں، لیکن ماریہ رضی اللہ عنہا کو شامل کر کے کل تعداد دس بنتی ہے۔ اور آپ کو نہ صرف اس تعداد پر بڑھانے سے روکا گیا بلکہ اس بات سے بھی کہ ان بیبیوں میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ اور نکاح کریں اور ﴿اِلَّا مَا مَلَکَتۡ یَمِیۡنُکَ﴾ سے مراد وہی بیبیاں ہیں جو بذریعہ عہد آپ اپنے نکاح میں لے چکے ہیں۔ کیونکہ اوپر لفظ تھے ﴿لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ﴾ اس کے بعد تیرے لیے عورتیں حلال نہیں۔ اس لیے بتایا کہ جو تیرے نکاح میں ہیں وہ حلال ہیں اور جن لوگوں نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے غلطی کی ہے کیونکہ یہ سب کو مسلم ہے کہ اس کے بعد آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا بلکہ 7 ہجری کے بعد آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کو منسوخ اس سے پہلی سے کہا گیا ہے۔ اور آئندہ نکاحوں سے اس لیے بھی روک دیا کہ بڑی ضرورت جو جنگوں کی وجہ سے پیش آئی تھی وہ اس نویں سال میں جب یہ واقعہ ایلاء اور تخییر پیش آیا ختم ہو چکی تھی اور ملک عرب میں امن قائم ہو چکا تھا۔

2666- یہ ہدایت آنحضرت ﷺ کے <u>وقت کی قدر سکھانے کے لیے</u> ہے اور عموماً ہر انسان کے وقت کی قدر سکھانے کے لیے۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ دعوتوں میں کھانے سے پہلے اور پیچھے بہت وقت باتوں میں ضائع کرتے جن سے حاصل کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یہی دستور آج بھی مہذب سوسائٹی میں ہے اور یورپ کی نقل میں مسلمانوں کی دعوتوں پر کئی کئی گھنٹے لغو باتوں میں ضائع ہوتے ہیں۔ اور انہی لوگوں کو اگر کہا جائے کہ کبھی خدا کے آگے بھی سجدہ کر لو تو جواب دیتے ہیں کہ فرصت نہیں ملتی۔ تو اس ہدایت میں صرف

مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ

سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے ان سے مانگو۔ یہ تمہارے دلوں کے لیے اور ان کے دلوں کے لیے بہت پاک ہے۔ (2667) اور تمہیں مناسب نہیں کہ اللہ کے رسول کو ایذا دو اور نہ یہ کہ اس کی بیویوں سے اس کے بعد کبھی نکاح کرو۔

نبی کریم ﷺ کے وقت کی قدر ہی نہیں سکھائی بلکہ مسلمانوں کو اپنے وقت کی قدر بھی سکھائی ہے۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی ہدایات کی قرآن شریف میں کیا ضرورت تھی؟ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی ہیں جن سے انسان کی زندگی مفید یا غیر مفید ہوجاتی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے آرام کے لیے یہ ہدایات قرآن میں داخل کردیں۔ حالانکہ اگر **آپ کے اشغال** پر ایک سرسری نظر بھی ان لوگوں کی ہوتی تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ آپ کے کندھوں پر جس قدر بوجھ تھا آج تک کسی ایک انسان کے کندھوں پر اتنا بوجھ نہیں ہوا۔ ایک طرف بادشاہت ہے اور ملک کا نظم ونسق، دوسری طرف جنگیں ہیں ان کا انتظام، دشمن جہاں جہاں ہیں ان کی خبر رکھنا اور انسداد کے لیے تجاویز کو عمل میں لانا، انتظام ملکی قائم کرنا، تنازعات کا فیصلہ کرنا، قانون بنانا، پھر قوم کی ساری مذہبی اور روحانی ضروریات کا انتظام، اخلاق سکھانا، تمدن اور معاشرت کے اصول بتانا، ہر قسم کی بدیوں کو اور بدرسوم کو جڑ سے اکھیڑنا، نمازیں پڑھانا، بیماروں کی خبر گیری، بیکسوں کی فکر۔ اگر اس کثرت کار میں جس کی نظیر دنیا میں کسی اور انسان کی زندگی میں نہیں ملتی آپ کے اشغال کی خاطر ہی یہ ہدایت دی جاتی تو بھی اس کی سخت ضرورت تھی۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس ہدایت کو دے کر ہر مسلمان کو اپنے وقت کی قدر کرنا سکھایا ہے اور بتایا ہے کہ اپنے اوقات کو فضول باتوں میں ضائع نہ کیا کریں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ نبی ﷺ اپنی حیائے جبلی کی وجہ سے بڑی بڑی تکالیف اٹھا لیتے تھے لیکن دوسروں کو کچھ کہنا پسند نہ کرتے تھے کہ انہیں ناگوار خاطر نہ ہو۔ مگر وحی الٰہی ایک خارجی شے تھی۔ اس آیت کا نزول اس دعوت پر ہوا جو زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش کے ساتھ نکاح کے بعد نبی کریم ﷺ نے دی تھی۔

2667- گو یہاں ازواج مطہرات کا ذکر نہیں ہوا مگر اوپر ﴿بُيُوْتَ النَّبِيِّ﴾ کے ذکر کی وجہ سے یہاں انہی کا ذکر سمجھا گیا ہے۔ روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، نیک بھی اور بدکار بھی، اس لیے امہات المومنین کو مردوں سے پردہ کرنے کا حکم دیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ خاص ضرورت بھی نبی کریم ﷺ کے لیے تھی۔ لیکن جس بات کا حکم امہات المومنین کو دیا گیا اور جس طرح انہوں نے اس کی تعمیل کی وہی حکم سب مسلمان عورتوں کے لیے ہے۔ اور امہات المومنین کے نمونہ پر ہی ان کو بھی چل کر دکھانا چاہیے۔ واقعی یہ حکم حجاب نہایت درجہ قلوب کی پاکیزگی کا موجب ہے۔ مردوں اور عورتوں کا وہ کھلا میل جول جو یورپ میں مروج ہے اس نے اس قدر تمام قلوب کو ناپاک کردیا ہے جس کا نتیجہ زنا کی کثرت میں کھلا کھلا نظر آرہا ہے۔ اسلام کے احکام اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہیں۔ جہاں عورتوں کے مردوں کے

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿۵۳﴾ یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے۔ (2668)

اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾ اگر تم کچھ ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ تو اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

سامنے آئے بغیر کام ہوسکتا ہے وہاں ان کو سامنے آنے سے روک دیا ہے اور یوں عورتوں کو ناپاک مردوں کے جذبات کا شکار ہونے سے بچایا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ضرورت کے وقت بھی عورتوں کو باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے۔ باوجود اس حکم حجاب کے نبی کریم ﷺ کی بیبیاں جنگوں میں شریک ہوتی تھیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کی بیبیاں اپنے ضروری کاروبار کرتی تھیں، عورتیں مسجدوں میں جاتی تھیں، وعظ ونصیحت کی مجالس میں جاتی تھیں۔ اور بخاری کی حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد اسی آیت کی تفسیر میں صاف طور پر مذکور ہے [قَدْ أُذِنَ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ لَا تَدْخُلُوا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ...: 4795) تمہیں یہ اجازت ہے کہ اپنی ضرورت کے لیے باہر نکلو۔ یہ حکم حجاب 5 ہجری کا ہے اور پردہ کے احکام میں سب سے پہلے نازل ہوا۔

2668- اس حصہ میں اول رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے سے منع فرمایا اور **یہ ایذا دینا آپ کے متعلق غلط باتوں کے پھیلانے سے تھا** اور یہ کام اصل میں منافق کرتے تھے اور بعض مسلمان اپنی سادگی سے ان باتوں کو پھیلا دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اس قسم کے جھوٹے قصے منافقین کے مشتہر کردہ روایات میں بھی راہ پا گئے ہیں۔ مثلاً زینب رضی اللہ عنہا کو دیکھنے کا قصہ جو صریحاً ایک باطل قصہ ہے۔ ایسا ہی اور بعض باتیں منافقین نے مشتہر کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیں۔ افسوس ہے کہ آج تک مسلمان اپنے بھولے پن سے بعض روایات کو مانتے چلے جاتے ہیں اور قرآن کریم پر تدبر نہیں کرتے کہ کس طرح انہیں ایسی ایذا دینے والی باتوں کی تشہیر سے روکا گیا تھا۔

دوسرے حصہ میں **آپ کی ازواج سے نکاح روکا**۔ اس پر عیسائی معترضین کی نکتہ چینی محض عداوت حق کا نتیجہ ہے۔ سوائے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نبی کریم ﷺ کی بیبیاں سب بیوہ تھیں اور ایک بی بی مطلقہ تھیں۔ پس اس حکم میں ذاتی غرض نبی کریم ﷺ کی کیا ہوسکتی تھی۔ جب ازواج مطہرات کو امہات المومنین قرار دیا تو اس بات سے بھی روکا کہ آپ کے بعد انہیں کوئی شخص اپنے نکاح میں لائے۔ کیونکہ بی بی بننے سے اس مرتبہ بلند سے گر کر ایک ادنیٰ حیثیت قبول کرنی پڑتی اور یہ ظاہر ہے کہ جو بی بی کسی دوسرے کے نکاح میں آجائیں ان کی وہ حیثیت ام المومنین ہونے کی باقی نہ رہتی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ غرض بھی مفقود ہوجاتی جس کے لیے وہ نبی کریم ﷺ کی زوجیت میں آئی تھیں۔ پھر وہ نمونہ کہاں دکھا سکتی تھیں جو نبی کی بی بی ہونے کی حیثیت میں دکھایا اور علاوہ اس کے زوجہ کی حیثیت میں خاوند کے بعض خیالات کا اثر ان پر ضرور پڑتا اور یہ بات خود موجب فتنہ ہوتی۔ جب تمام دنیوی آسائشوں کو جو نبی کریم ﷺ کی زوجیت کی خاطر ترک کیا تو یہ بھی ایک آسائش تھی جسے ترک کر دیا گیا۔ جس طرح ان کا باقی آسائشوں کو ترک کرنا دین کے لیے ضروری تھا اسی طرح اس آسائش کو ترک کرنا بھی دین کی خاطر ضروری تھا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَ لَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَ لَآ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَ لَا نِسَآئِهِنَّ وَ لَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَ اتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۵۵﴾

ان پر اپنے باپوں (کے سامنے ہونے) میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی عورتوں کے اور نہ اس کے جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہیں۔ اور (اے بیبیو) اللہ کا تقویٰ کرو، اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ (2669)

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾

اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اس پر درود بھیجو اور سلام بھیجو۔ (2670)

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا یہاں سے ازواج مطہرات میں ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ یہ حکم ازواج کے لیے ہے اور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کو بھی ازواج میں شمار کر کے اس حکم کے ماتحت سمجھا گیا۔ حالانکہ اگر ان کی حیثیت لونڈی کی ہوتی تو وہ ازواج میں داخل نہ ہوتیں بلکہ ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ میں داخل کر کے انہیں اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس عمل نے ان کے ازواج میں سے ہونے کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔

اس آیت کے شان نزول میں جو بعض باتیں لکھی ہیں کہ فلاں صحابی نے یوں کہا تھا، تو وہ منافقین کی انہی ایذا دہ باتوں میں سے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اور جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ منافق ایسی باتیں کہتے تھے، یہی صحیح ہے۔

2669- یہ استثنا اظہار زینت میں ہے، عام عورتوں کے لیے اس کی مثل حکم سورۂ نور میں گزر چکا [دیکھو نمبر: 2324]۔ ابن سعد نے زہری سے روایت کی ہے کہ اس حکم میں ہر ایک ذی محرم شامل ہے۔ نسب سے ہو یا رضاع سے۔

2670- **آنحضرت ﷺ پر درود:** اللہ اور فرشتوں کی صلوٰۃ کے متعلق دیکھو [دیکھو نمبر: 2660]۔ یہاں مومنوں کو حکم ہے کہ تم بھی صلوٰۃ بھیجو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کس طرح آپ پر صلوٰۃ بھیجیں۔ تو آپ نے فرمایا یوں کہو: [اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ.] (صحيح البخارى، كتاب أحاديث الأنبياء، (باب) حديث: 3370) ایک حدیث کا منکر استہزا کے طور پر کہتا ہے کہ خدا نے تو مومنوں کو حکم دیا تھا کہ نبی

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۵۷﴾

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر اللہ نے دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کیا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۸﴾ ع 7 6 4

اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے (قصور) کیا ہو تو وہ بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ (2671)

پر صلوٰۃ بھیجیں، یہ خدا کو کہتے ہیں کہ تو نبی پر صلوٰۃ بھیج۔ اس استہزا کی وجہ جہالت ہے۔ اللہ کی صلوٰۃ اور بندوں کی صلوٰۃ دو مختلف چیزیں ہیں۔ بندے خود تو کوئی طاقت نہیں رکھتے کہ وہ نبی پر صلوٰۃ بمعنی مغفرت یا برکت بھیجیں۔ مغفرت اور برکات کا سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے مومنوں کا صلوٰۃ بھیجنا سوائے اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں [دیکھو نمبر: 2660] اور یہ کہنا کہ انہیں الفاظ کو دہرایا جائے جو قرآن شریف میں ہیں، اس سے بھی بڑھ کر جہالت ہے۔ قرآن شریف ایک کام کے لیے ایک حکم دیتا ہے اس کی تعمیل یہ نہیں کہ ہم حکم کو رٹتے جائیں۔ کیا ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ کے حکم کی تعمیل یوں ہو جائے گی کہ ہم بھی وظیفہ کرتے رہیں ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾۔ یا حکم ہو کہ استغفار کرو تو ہم بھی کہتے رہیں استغفار کرو یا حکم ہو کہ اللہ کو بہت یاد کرو تو ہم بھی کہتے رہیں کہ اللہ کو بہت یاد کرو۔ اور نبی ﷺ پر صلوٰۃ بھیجنے سے نہ صرف آنحضرت ﷺ سے محبت پیدا ہوتی ہے بلکہ ان فیوض و برکات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے جو آپ کی وساطت سے دنیا کو پہنچ رہے ہیں۔ اور احادیث درود شریف کی فضیلت سے بھری پڑی ہیں۔

یہ ذکر ایذا کی باتوں کے بالمقابل کیا ہے یعنی ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو ایذا کی باتیں کرتے ہیں تو مومنوں کو حکم ہوتا ہے کہ تم آپ ﷺ کے لیے رحمت و برکت کی دعا کرو۔ جس میں اشارہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عزت و مرتبہ دنیا میں ترقی کرتا رہے گا۔ کیونکہ جو دعا اللہ تعالیٰ خود سکھاتا ہے وہ ضائع نہیں ہو سکتی۔

2671- آنحضرت ﷺ کے ذکر کے بعد عام مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ذکر کر کے بتایا کہ نیک اور پاک لوگوں پر تہمت لگانے والے خواہ وہ پاک لوگ خود نبی ہوں یا ان کے ساتھی سب ایک حکم میں ہیں۔ جو لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم پر اور ائمہ اور مجددین پر ناپاک تہمتیں لگاتے ہیں وہ غور کریں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۹

اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں تو انہیں ایذا نہ دی جائے۔ اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2672)

2672- ﴿يُدْنِيْنَ﴾ دَنٰی کے معنی ہیں قریب ہوا اور اَدْنٰی کے معنی ہیں دوسری چیز کو قریب کیا اور یہاں چادروں کو قریب کرنے سے مراد ان کا اوڑھنا ہے۔

﴿جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ جَلَابِيْب۔ جِلْبَابٌ کی جمع ہے۔ جَلْب سے جس کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ چلانا ہیں۔ اور جِلْبَابٌ قمیص کو کہتے ہیں اور جِلْبَابٌ ایک کپڑے کو کہتے ہیں جو خِمَارٌ یعنی اوڑھنی سے بڑا ہوتا ہے جس کے ساتھ عورت اپنے سر اور سینہ کو ڈھانک لیتی ہے۔ اور یہاں جِلْبَابٌ سے مراد خِمَارٌ یعنی اوڑھنی ہے۔ (ل) اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر ایک وہ لباس ہے جو ستر کا کام دے یا کپڑوں کے اوپر پہنا جائے (جیسے اوورکوٹ) اور انصار کی عورتیں سیاہ لباس اوپر سے پہنتی تھیں۔ (ر)

پردہ یا زینت کو ڈھانکنے کا ایک حکم سورۂ نور میں گزر چکا ہے۔ ﴿وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ [النور: 31:24] یعنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈال لیں اور ایک حکم یہاں ہے کہ جِلْبَابٌ اوڑھ لیں۔ سورۂ نور کا نزول بھی پانچویں سال ہجرت کا ہے اور اس سورت کا نزول بھی پانچویں سال ہجرت میں ہی شروع ہوا۔ اس لیے غور طلب یہ ہے کہ ان دونوں حکموں میں سے پہلے کون سا حکم نازل ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر سورۂ نور کا حکم پہلے نازل ہو چکا ہوتا تو پھر اس حکم کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہاں یہ ذکر ہے کہ مسلمان بیبیاں چادریں اوڑھ لیا کریں تاکہ پہچان لی جائیں۔ اور اگر وہ پہلے ہی چادریں اوڑھتیں ہوتیں تو انہی سے پہچان لی جاتیں۔ پس یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ پہلے یہ حکم نازل ہوا ہے اور اس کی غرض صرف اسی قدر تھی کہ مسلمان بیبیوں کو شہر کے بدمعاش تکلیف نہ دیں۔ کیونکہ روایات سے ثابت ہے کہ لونڈیاں اور آزاد عورتیں رات کو جب قضائے حاجت کے لیے باہر نکلتیں تو بعض بدمعاش رستوں پر بیٹھے رہتے اور عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے اور پھر عذر کر دیتے کہ ہم نے اس بی بی کو لونڈی خیال کیا تھا۔ تو پس یہ ایک امتیازی نشان قرار دیا گیا جس سے شریف عورتیں پہچانی جا سکیں اور کوئی ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پس اصل یہ ہے کہ سب سے پہلے حکم حجاب نازل ہوا [دیکھو نمبر: 2667] اس کے بعد یہ حکم نازل ہوا۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے باہر نکلنے کے واقعہ میں ہے [بَعْدَ مَا ضُرِبَ الْحِجَابُ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ...: 4795) اور چونکہ چھیڑ چھاڑ ایک عارضی بات تھی اس لیے مستقل حکم سورۂ نور میں دیا کہ عورتیں زینت کو چھپا کر باہر نکلا کریں اور چادریں اوپر ڈال لیا کریں۔ پس جِلْبَابٌ اور خِمَارٌ سے ایک ہی مراد ہے جیسا کہ لسان العرب میں بھی ہے۔ اور اس جِلْبَابٌ کی غرض انہی مقامات کو ڈھانکنا

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾

اگر منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں بری خبریں اڑانے والے باز نہ آئیں تو ہم تجھے ان کے خلاف اٹھائیں گے پھر وہ اس (شہر) میں تیرے ساتھ نہ رہنے پائیں گے مگر تھوڑا۔ (2673)

مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾

پھٹکارے ہوئے جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور قتل کیے جائیں گے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾

(ایسا ہی) اللہ کا قانون ان میں (رہا ہے) جو پہلے گزر چکے۔ اور تو اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾

لوگ تجھ سے (موعود) گھڑی کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دے، اس کا علم صرف اللہ کو ہے اور تجھے کیا معلوم ہے کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔

ہے جن کی تشریح سورۂ نور میں ہے [دیکھو نمبر: 2322]۔ اور اس موقعہ پر ابن جریر میں دونوں قسم کے قول منقول ہیں۔ ایک یہ کہ جِلْبَابٌ سے منہ ڈھانکا جاتا تھا اور صرف ایک آنکھ کھلی چھوڑ دی جاتی تھی۔ اور دوسرا یہ کہ جِلْبَابٌ صرف پیشانی پر باندھی جاتی تھی۔ اور اس دوسرے قول کی تائید چونکہ سورۂ نور سے ہوتی ہے اس لیے یہی معنی مراد ہیں۔

2673- ﴿الْمُرْجِفُوْنَ﴾ مُرْجِفُوْنَ [دیکھو نمبر: 1113] اور ﴿الْمُرْجِفُوْنَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو جھوٹی خبریں پھیلا کر لوگوں میں اضطراب پیدا کرتے تھے اور جب لوگ بری خبروں اور فساد کی باتوں کے ذکر میں لگ جائیں تو کہا جاتا ہے [اَرْجَفَ الْقَوْمُ] (ل)

﴿لَنُغْرِيَنَّكَ﴾ نُغْرِيَنَّكَ۔ غِرَاءٌ وہ ہے جس سے کسی چیز کو دوسری سے چپکایا جاتا ہے اور اِغْرَاءٌ کے معنی برانگیختہ کرنا ہیں۔ ﴿فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ﴾ [المآئدۃ: 14:5] ''سو ہم نے ان کے درمیان دشمنی ڈال دی۔'' (غ)

اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جو رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کے متعلق ایذا دہ باتیں کرتے تھے۔ ان کے متعلق یہاں صریح پیشگوئی ہے کہ آخر کار یہ یا تو ان باتوں سے رک جائیں گے ورنہ مدینہ سے نکال دیئے جائیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾

اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے جلتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾

ہمیشہ اس میں رہیں گے نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾

جس دن ان کے منہ آگ میں الٹائے جائیں گے کہیں گے اے کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾

اور کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی سو انہوں نے ہمیں رستہ سے گمراہ کر دیا۔

رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ ع 8 10 5

اے ہمارے رب! انہیں دو چند عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت کر۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو ایذا دی، سو اللہ نے اسے اس سے بری کیا جو وہ کہتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک مرتبے والا تھا۔ (2674)

2674- **حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بریت کا ذکر:** بخاری میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے ایذا دینے کا قصہ یوں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام لوگوں سے شرم کی وجہ سے اپنے جسم کو بہت چھپایا کرتے تھے تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ موسیٰ کو برص کی بیماری ہے یا کوئی اور بیماری ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے سامنے ننگے نہیں ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جب ان کی بریت کا ارادہ کیا تو یوں ہوا کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہائی میں ننگے نہا رہے تھے اور کپڑے ایک پتھر پر رکھے ہوئے تھے، تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے بھاگے یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے لوگوں کے سامنے آ گئے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ آپ کو ایسی کوئی بیماری نہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے لے لیے اور پتھر کو مارنا شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ کرو اور سیدھی بات کہو۔

يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾

وہ تمہارے لیے تمہارے عملوں کی اصلاح کرے گا اور تمہارے گناہ تمہیں بخش دے گا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے بڑی بھاری کامیابی حاصل کی۔ (2675)

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾

ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے انکار کیا کہ اس کا بوجھ اٹھائیں اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کا بوجھ اٹھالیا۔ وہ بڑا ظلم کرنے والا بڑا جاہل ہے۔ (2676)

یہ بخاری کی حدیث ہے۔ مگر بخاری کتاب اللہ نہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ایک ایک حرف واقعی رسول اللہ ﷺ کے منہ سے نکلا ہوا ہے اور اس لیے اس کے ہر ایک لفظ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ممکن ہے یہ روایت ہی غلط ہو یا رسول اللہ ﷺ کے الفاظ پورے طور پر محفوظ نہ رہے ہوں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ ایذا دینا آپ پر ہارون علیہ السلام کے قتل کا الزام دینا تھا۔ (ث) اور بعض روایات میں ہے کہ آپ پر نعوذ باللہ زنا کا الزام لگایا گیا تھا۔ (ر) اور اس آخری روایت کے مطابق بائبل [گنتی: 1:12] میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے ان پر ان کی کوشی بی بی کے متعلق کچھ الزام لگایا تھا۔ اور اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ یہ زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے قصہ میں نازل ہوئی۔ (ر) تو یہ بات بھی بائبل کے بیان کی مؤید ہے۔ اور حق بھی یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر یہاں قطعاً اصل مقصود نہیں۔ بلکہ یہ بتانا ہے کہ نبی ﷺ پر اسی طرح کا الزام لگایا گیا اور اس میں کچھ شک معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے متعلق جو بعض قصے روایات میں آ گئے ہیں یہ منافقوں نے بنا کر مشہور کیے، اور یہی وہ روایت ہے جس کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ اور یوں قرآن کریم نے ان ناپاک قصوں کی تردید کی ہے۔

2675- کاش مسلمان ان آیات پر غور کریں۔ مسلمانوں کی کامیابی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ہے دوسری قوموں کی نقل سے کچھ نہیں بنے گا۔

2676- ﴿يَّحْمِلْنَهَا .... حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ زجاج کا قول ہے کہ یہاں ﴿يَّحْمِلْنَهَا﴾ کے معنی ہیں اس میں خیانت کریں اور امانت

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۟ ع

تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے اور (تاکہ) اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں پر رجوع برحمت کرے۔ اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2677)

یہاں وہ فرائض ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مقرر کیے ہیں اور طاعت اور معصیت اور اسی طرح تفسیر میں آیا ہے اور انسان اس جگہ کافر اور منافق ہے۔ اور ابو اسحاق اس آیت کے متعلق کہتے ہیں کہ حقیقت اس کی یہ ہے واللہ اعلم کہ اللہ تعالیٰ نے **بنی آدم کو وہ امانت دی** جو ان پر اپنی اطاعت سے فرض کیا ہے اور آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو بھی امانت دی جیسا کہ فرمایا ﴿اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝﴾ [حٰمٓ السجدة: 11:41] ''آجاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا ہم دونوں خوشی سے حاضر ہیں۔'' سو اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا کہ آسمان اور زمین نے امانت کو نہیں اٹھایا یعنی اسے ادا کیا اور ہر شخص جو امانت میں خیانت کرتا ہے وہ امانت کو اٹھاتا ہے جس طرح گناہ کرے تو کہتے ہیں [حَمَلِ الْاِثْمِ...] اور آسمانوں اور زمین نے انکار کیا کہ امانت کا بوجھ اٹھائیں اور اس امانت کو ادا کیا، اور اس کا ادا کرنا اللہ کی طاعت ہے اس میں جو انہیں حکم دیا اور اس پر عمل کرنا اور معصیت کا ترک کرنا۔ اور ﴿حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ میں حسن کہتے ہیں کافر اور منافق مراد ہے۔ انہوں نے امانت کا بوجھ اپنے اوپر لیا یعنی اس میں خیانت کی اور اطاعت نہ کی۔ اور یہ معنی واللہ اعلم صحیح ہیں۔ اور جو کوئی انبیاء اور صدیقوں اور مومنوں میں سے اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اسے ظلوم جہول نہیں کہا جاتا اور اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے جو آگے آتا ہے ﴿لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ﴾ ابو منصور کہتے ہیں اور کسی نے آیت کی یہ تفسیر نہیں کی جو ابو اسحاق نے کی ہے اور شاعر کے قول سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حمل امانت سے مراد اس کی خیانت اور ادا نہ کرنا ہے۔ [اِذَا اَنتَ لَمْ تَبْرَحْ تُؤَدِّي اَمَانَةً * وَ تَحْمِلُ أُخْرَى أَفْرَحَتْكَ الْوَدَائِعُ] (روح المعانی، جلد22، صفحہ 99) جہاں [تَحْمِلُ أُخْرَى] سے مراد ہے کہ اس میں خیانت کرتا ہے اور اسے ادا نہیں کرتا۔ (ل) اور بعض نے حمل امانت سے مراد فرائض انسانی کا اختیار کرنا لے کر ظَلُوْمٌ سے مراد لی ہے کہ باوجود ضعف کے اس امانت کو لے لیا اور یہ اپنے نفس پر ظلم تھا۔ اور جَهُوْلٌ سے مراد لی ہے کہ عاقبت کو نہ سوچا۔ مگر اس میں بعد ہے اور سیاق مضمون پہلے معنی کو ہی چاہتا ہے۔

2677- اس میں بتایا کہ عذاب درحقیقت اسی خیانت کا نتیجہ ہے جو انسان کرتا ہے یعنی جب وہ ان قویٰ کو جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیئے ہیں ٹھیک طور پر استعمال نہیں کرتا تو اس کا نتیجہ دکھ ہوتا ہے۔

سورۃ سبا

نام:

اس سورت کا نام سَبَإٍ ہے اور اس میں 6 رکوع اور 54 آیتیں ہیں۔ سبا کی قوم ملک یمن میں رہتی تھی اور ان کی تباہی کا واقعہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے قریب ترین تھا یعنی یہ پہلی یا دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ اور یوں بھی ان کا مسکن حجاز کے بالکل قریب تھا۔ اور قریش کی یمن میں اغراض تجارت کے لیے آمد و رفت بھی بہت تھی۔ پس مکان اور زمانہ ہر دو کے لحاظ سے یہ واقعہ بہت قریب کا تھا اور اس کی طرف خصوصیت سے قریش کو پھر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ نعمتوں کے بعد ناشکری پر اللہ تعالیٰ اظہار ناپسندیدگی بھی فرمایا کرتا ہے۔

خلاصۂ مضمون:

① سب سے پہلے رکوع میں بتایا کہ نتائج اعمال حق ہیں۔ اچھے کاموں کا نتیجہ عزت اور راحت ہے اور برے کاموں کا نتیجہ ذلت اور دکھ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے اور قوموں کی عزت و ذلت میں ان کے عروج اور بربادی میں یہی کام کرتا ہے۔

② دوسرے رکوع میں بتایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اس کے اعمال حسنہ کی وجہ سے انعام کرتا ہے پھر وہ قوم ناشکری کرتی ہے تو وہ بھی اس ناشکری کی سزا پاتی ہے۔ اور مثال کے طور پر پہلے داؤد علیہ السلام و سلیمان علیہ السلام کے ماتحت بنی اسرائیل کے غلبہ کا اور پھر سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے زوال کا ذکر کیا۔ اور ایسا ہی قوم سبا پر انعامات اور سلب انعام کا ذکر کیا۔

③ تیسرے رکوع میں بتایا کہ مومنوں کا کفار سے مقابلہ ہوگا اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی نصرت ملے گی اور وہ غالب ہوں گے۔

④ چوتھے رکوع میں مخالفت کرنے والوں کا ذکر کیا کہ ایک سرگروہ ہیں جو حق کی مخالفت کے لیے لوگوں کو اکساتے ہیں اور دوسرے بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرتے ہیں۔

⑤ پانچویں رکوع میں بتایا کہ کثرت مال جس پر انسان بھول جاتا ہے کوئی فخر کا مقام نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں سے پہلی قوموں کو اس قدر حصہ دیا کہ کفار قریش ان کے مقابل پر مال دنیا کی کثرت کے لحاظ سے کچھ وقعت نہیں رکھتے۔

⑥ اور آخری رکوع میں سورت کو یہ بتا کر ختم کیا کہ حق کا آنا بے فائدہ نہیں، وہ غالب آ کر رہے گا۔

تعلق:

پچھلی سورتوں میں اسلام کے غلبہ کی پیشگوئیاں کیں اور آخر سورۂ احزاب میں دکھا بھی دیا کہ اسلام کو کفر کی کوئی طاقت تباہ نہیں کر سکی تو اب ایک ایسی سورت اس کے بعد رکھی ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ یہ انعام جو مسلمانوں پر ہوا محض ان کے اعمال کے لحاظ سے ہوا۔ اگر نعمت کے ملنے پر انہوں نے ناشکری کی تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان سے پہلے قوموں کا ہوا۔

اٰيَاتُهَا 54 (34) سُوْرَةُ سَبَإٍ مَّكِّيَّةٌ (58) رُكُوْعَاتُهَا 6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۱

سب تعریف اللہ کے لیے جس کا وہ (سب کچھ) ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور آخرت میں (بھی) اسی کی تعریف ہے اور وہ حکمت والا خبردار ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَ هُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ۝۲

وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور وہ رحم کرنے والا بخشش کرنے والا ہے۔ (2678)

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَ لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۳ۙ

اور کافر کہتے ہیں وہ گھڑی ہم پر نہیں آئے گی۔ کہہ، ہاں میرے رب کی قسم! (جو) غیب کا جاننے والا ہے وہ تم پر آ کر رہے گی۔ اس سے ایک ذرہ بھی غائب نہیں رہتا (نہ) آسمان میں اور نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹا اور نہ بڑا مگر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں ہے۔

زمانۂ نزول:

یہ سورت بالاجماع مکی ہے۔ اس کے زمانہ نزول کی تعیین مشکل ہے۔ لیکن نفس مضمون کے لحاظ سے گو بہت ابتدائی سورتوں میں سے نہیں، مگر بہت پچھلے زمانہ کی بھی نہیں۔

2678- اس میں اپنے جسمانی اور روحانی قوانین کی طرف توجہ دلائی ہے۔ زمین میں داخل ہونے والی چیز پانی ہے اور اس سے نکلنے والی سبزی اور روئیدگی ہے۔ یہ تو جسمانی قانون ہے اور اس کے مقابل پر روحانی قانون یہ ہے کہ آسمان سے وحی اترتی ہے جو پانی کے مشابہ ہے اور اس میں چڑھنے والی چیز عمل ہے اور انہی نتائج اعمال کے حق ہونے کی طرف ہی اس رکوع میں توجہ دلائی ہے۔

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

تا کہ ان لوگوں کو بدلہ دے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور عزت والا رزق ہے۔

وَ الَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝۵

اور جو لوگ ہماری آیتوں کے ہرانے میں کوشش کرتے ہیں ان کے لیے سخت قسم کا دردناک عذاب ہے۔

وَ يَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَ يَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۶

اور وہ جنہیں علم دیا گیا ہے جانتے ہیں کہ وہ جو تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا وہی سچ ہے اور اس کا رستہ دکھاتا ہے جو غالب تعریف کیا گیا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۷ۚ

اور کافر کہتے ہیں کیا ہم تمہیں ایک آدمی بتائیں جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو پھر تم ایک نئی پیدائش میں آؤ گے۔ (2679)

اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَ الضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝۸

اس نے اللہ پر جھوٹ بنایا ہے یا اسے جنون ہے بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ عذاب میں اور دور کی گمراہی میں ہیں۔

2679- ﴿مُزِّقْتُمْ﴾ مَزْقٌ کپڑے وغیرہ کے پھاڑنے کو کہا جاتا ہے۔ اور کسریٰ کو خط لکھنے کی حدیث میں آتا ہے: [لَمَّا مَزَّقَهُ فَدَعَا عَلَيْهِمْ اَنْ يُّمَزَّقُوا كُلَّ مُمَزَّقٍ] (صحيح البخاری، كتاب المغازی، باب كِتَابِ النَّبِيِّ ﷺ اِلٰى كِسْرٰى وَقَيْصَرَ، حديث: 4424) اور تَمْزِيْقٌ کے معنی پھاڑنا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہیں۔ اور ان کی تَمْزِيْقٌ سے مراد ان کی پراگندگی اور زوال ملک ہے۔ (ل)

اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۹

کیا وہ اس پر غور نہیں کرتے جو ان کے سامنے اور جو ان کے پیچھے آسمان اور زمین سے ہے۔ اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں نابود کر دیں۔ یا ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں۔ اس میں ہر ایک رجوع کرنے والے بندے کے لیے نشان ہے۔ (2680)

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ ۚ وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝۱۰

اور داؤد کو ہم نے اپنی طرف سے بزرگی دی۔ اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو (ان کے) کام میں لگایا اور ہم نے ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ (2681)

2680- مراد یہ ہے کہ زمینی یا آسمانی عذاب سے ہلاک کر دیں۔ [دیکھو نمبر: 1877]

2681- ﴿اَوِّبِيْ﴾ اَوْبٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 385]۔ اور اَوْبٌ اور اَبٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی رَجَعَ یا لوٹا۔ اور یہاں اَوِّبِيْ کے معنی سَبِّحِيْ یعنی تسبیح کرو یا تسبیح کو لوٹاؤ۔ اور اِيَابٌ کے معنی بھی رجوع ہیں ﴿اِنَّ اِلَيْنَاۤ اِيَابَهُمْ ۝﴾ [الغاشية: 25:88] ''ہماری طرف ہی ان کا لوٹ کر آنا ہے۔'' اور اَوْبَةٌ بمعنی رجوع تَوْبَةٌ کی طرح ہے اور اَوَّابٌ اللہ تعالیٰ کی طرف بکثرت رجوع کرنے والا ہے یا تسبیح کرنے والا یا فرمانبردار یا وہ جو توبہ اور طاعت کی طرف لوٹ آتا ہے ﴿دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ﴾ [صٓ: 17:38] ''داؤد قوت والا، وہ (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا۔'' (ل)

﴿اَلَنَّا﴾ لَيَّنَ سے ہے۔ لَانَ کے معنی ہیں نرم ہوا اور اَلَانَ کے معنی وہی ہیں جو لَيَّنَ کے ہیں یعنی اسے نرم کیا۔

بنی اسرائیل پر جو انعام ظاہری ہوا یعنی حکومت اور بادشاہت وہ اپنے کمال کو داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام میں پہنچا۔ اس لیے یہاں انہیں دو کا ذکر کیا ہے۔ اصل غرض تو قوم سبا کا ذکر ہے لیکن چونکہ سبا کی بڑائی اور عظمت کا زمانہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے تعلق رکھتا ہے اس لیے تمہیداً پہلے داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ جب اللہ تعالیٰ انعام دیتا ہے اور اس کے بعد قومیں ظلم اور زیادتی کرتی ہیں تو پھر ان کی پاداش بھی ملتی ہے۔ پہاڑوں کی تسبیح اور پرندوں کی تسخیر اور زرہوں کے بنانے کے لیے [دیکھو نمبر: 2173]۔ اور لوہے کے نرم کرنے سے کیا غرض ہے؟ یہ آگے خود بتایا یعنی یہ کہ زرہیں بناؤ اور لوہے کے نرم ہونے سے ہی چیزیں بن سکتی ہیں۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱﴾

کہ فراخ زرہیں بنا اور (ان کے) بنانے میں اندازہ نگاہ رکھ اور اچھے عمل کرو۔ جو تم کرتے ہو، میں اسے دیکھتا ہوں۔ (2682)

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾

اور سلیمان کے لیے ہوا کو (کام میں لگا دیا) اس کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ تھی اور شام کی منزل بھی ایک مہینے کی راہ۔ اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنوں میں سے کچھ وہ تھے جو اس کے سامنے اس کے رب کے حکم سے کام کرتے اور جو کوئی ان میں سے ہمارے حکم سے پھرتا ہم اسے جلتی ہوئی آگ کا عذاب چکھاتے۔ (2683)

2682- ﴿سٰبِغٰتٍ﴾ سَابِغٌ کی جمع ہے اور [دَرْعٌ سَابِغٌ] کامل فراخ زرہ کو کہتے ہیں۔ (غ) [دیکھو نمبر: 2608]

﴿السَّرْدِ﴾ سَرْدٌ ایک چیز کو دوسری کے پیچھے لانا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے [سَرَدَ الْحَدِيْثَ] اور آنحضرت ﷺ کے کلام کی صفت میں ہے [لَمْ يَكُنْ يَسْرُدُ الْحَدِيثَ كَسَرْدِكُم] (صحيح البخاری، كتاب المناقب، باب صِفَةِ النَّبِيِّ ﷺ، حديث: 3568) یعنی ایک بات کو دوسری کے پیچھے جلد جلد نہ لاتے تھے اور سَرْدٌ کے معنی سوراخ کرنا بھی آتے ہیں اور حلقوں کا ایک دوسرے میں داخل کرنا جیسے زرہ کے بنانے میں۔ (ل)

حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں دوسری جگہ ہے ﴿وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ﴾ [الأنبيآء: 80:21] ''اور ہم نے اسے تمہارے لیے زِرہ بنانی سکھائی۔ تاکہ تمہاری لڑائی میں تمہاری حفاظت کرے۔'' اور یہاں بھی ﴿سٰبِغٰتٍ﴾ سے مراد فراخ زرہیں ہیں۔ اور ﴿قَدِّرْ فِي السَّرْدِ﴾ سے مراد عموماً یہ لی گئی ہے کہ زرہ کے حلقوں کو مناسب اندازہ سے بنا۔ مگر ایک قول یہ ہے کہ زرہ کے بنانے میں اندازہ سے وقت صرف کرو اور سارا وقت اس میں صرف نہ کر دو۔ (ر) اور یہی معنی سیاق کے مطابق ہیں، کیونکہ آگے آتا ہے ﴿وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ مطلب یہ ہے کہ نبی کا کام نہیں کہ سارا زور جنگ پر صرف کر دے۔ وہ ایک ضرورت وقتی ہے اور اصل غرض اعمال صالحہ ہیں۔

2683- ﴿اَسَلْنَا﴾ سَیْل پانی کے سیلاب کو کہتے ہیں ﴿سَيْلَ الْعَرِمِ﴾ [16] اور [سَالَ الشَّيْءُ] کے معنی ہیں ایک چیز بہہ گئی اور اَسَلْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اسے بہا دیا اور اِسَالَةٌ فی الحقیقت قِطْرٌ کی وہ حالت ہے جو پگھلنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ (غ)

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

وہ اس کے لیے جو وہ چاہتا تھا بناتے تھے (یعنی) مسجدیں اور مجسمے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب اور ایک جگہ دھری رہنے والی دیگیں۔ اے آل داؤد شکر کرتے ہوئے عمل کرو۔ اور میرے بندوں میں سے تھوڑے شکرگزار ہیں۔ (2684)

اور ﴿عَيْنَ الْقِطْرِ﴾ سے مراد اصل میں تانبے کی کان ہے۔ (ر) اور بہانا اس لیے کہا کہ تانبا پگھلا کر کام میں لایا جاتا تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تسخیر ہوا پر [دیکھو نمبر: 2175] صبح اور شام کے آنے جانے کو شَهْرٌ کہا ہے یعنی ایک ماہ کا سفر، اور مطلب یہ لیا گیا ہے کہ صبح کے وقت اتنی دور پہنچا دیتی تھی کہ ایک مہینہ میں آدمی سفر کر سکے۔ اگر اس سے جہازوں کا چلنا مراد لیا جائے جو ہوا سے چلتے تھے تو مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ صبح کے وقت روانہ ہوئے شام تک اتنا سفر کر لیتے تھے جس قدر ایک ماہ میں کیا جاتا ہے اور ایسا ہی شام کے وقت چلے ہوئے صبح تک اتنا ہی کام کر لیتے اور یا مطلب ﴿غُدُوُّهَا﴾ سے ان کی کسی ملک کی طرف روانگی ہے اور ﴿رَوَاحُهَا﴾ رَوَاحٌ سے مراد ان کی واپسی۔ جس طرح چار پایوں کے شام کو گھر آنے کو اِرَاحَةٌ کہا جاتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک ایک مہینہ تک کے سفر پر آپ کے جہاز جاتے تھے۔ اور جنوں سے مراد وہی لوگ ہیں جنہیں دوسری جگہ شیاطین کہا ہے [دیکھو نمبر: 2176]۔ اور ﴿نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ میں مراد بعض نے عذاب اخروی لیا ہے اور بعض نے دنیا میں سزا دینا۔ (ر) اور جن معاملات میں تیز اور زود رس انسان کو بھی کہا جاتا ہے۔ [دیکھو نمبر: 1015]

2684- ﴿مَّحَارِيْبَ﴾ مِحْرَابٌ کی جمع ہے۔ جس کے لیے [دیکھو نمبر: 412] اور بنی اسرائیل کے مَحَارِیْب ان کی مسجدیں تھیں جن میں وہ بیٹھتے تھے یا نماز کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اور ﴿فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ﴾ [مریم: 11:19] ''سو وہ عبادت گاہ سے اپنی قوم پر نکلا۔'' میں مسجد بھی مراد لی گئی ہے۔ اور مِحْرَابٌ بمعنی قصر یا محل بھی آتا ہے اور کہا گیا ہے کہ مِحْرَابٌ وہ جگہ ہے جہاں بادشاہ لوگوں سے دور ہو کر الگ ہوتا ہے اور مسجدوں کے مِحْرَابٌ کو بھی مِحْرَابٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں امام لوگوں سے الگ ہوتا ہے۔ (ل)

﴿جِفَانٍ﴾ جَفْنَةٌ کی جمع ہے۔ کھانے کے برتن سے مخصوص ہے اور جَفْنٌ (جمع اَجْفَانٌ) پلک کو کہتے ہیں۔ (غ)

﴿قُدُوْرٍ﴾ قِدْرٌ کی جمع ہے جس میں گوشت پایا جاتا ہے۔ (غ) یعنی ہانڈی۔

﴿تَمَاثِيْلَ﴾ تمثال یا مجسمے جو سلیمان علیہ السلام کے لیے بنائے گئے بعض کے نزدیک حیوانات کے تھے، بعض کے نزدیک فرشتوں اور انسانوں کے اور بائبل میں ہے ''اس نے پاک ترین مکان میں دو کروبیوں کو تراش کر بنایا۔'' [2 تواریخ: 3:10] ''اور گرداگرد اس کے نیچے بیلوں کی صورتیں تھیں۔'' ''اور حورام نے برتن اور پھاوڑے اور کٹورے بنائے۔'' [2 تواریخ: 4:3-11] کہا گیا ہے کہ

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ؕ﴿۱۴﴾

سو جب ہم نے اس پر موت کا حکم صادر کیا تو انہیں اس کی موت کا پتہ کسی چیز نے نہ دیا مگر ایک زمین کے کیڑے نے جو اس کے عصا کو کھا گیا۔ سو جب وہ گر گیا جنوں پر واضح ہو گیا کہ اگر وہ غیب کو جانتے تو رسوا کرنے والے دکھ میں نہ رہتے۔ (2685)

اس شریعت میں تصاویر وغیرہ کا بنانا جائز تھا۔ مگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسی باتوں کے جواز یا عدم جواز کا انحصار نیات پر ہے۔

﴿اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ میں شُكْرًا کو بعض نے مفعول قرار دیا ہے یعنی شکر کے لیے عمل کرو نہ امید و بیم کے لیے۔ اور بعض نے مفعول مطلق، کیونکہ شکر بھی ایک نوع عمل ہے اور شُكْرًا حال ہے اور مراد ہے شَاكِرِيْنَ۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام باوجود بادشاہت کے جو کی روٹی کھاتے تھے اور موٹا پہنتے تھے۔

2685- ﴿مِنْسَاَتَهٗ﴾ مِنْسَأَةٌ۔ نَسْءٌ سے ہے جس کے معنی پیچھے ڈال دینا [دیکھو نمبر: 1290]۔ اور مِنْسَأَةٌ عصا کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس سے چیز کو پیچھے کر دیا جاتا ہے۔ (غ)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے عصا کو دیمک کے کھانے کا قصہ:

مفسرین نے یہاں ایک قصہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جب وفات قریب آئی تو انہوں نے دعا کی کہ میری موت کا علم جنوں کو نہ ہو، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جن علم غیب نہیں جانتے جیسا کہ انہیں دعویٰ تھا۔ چنانچہ آپ ایک عصا کا سہارا لیے کھڑے ہوئے حالت عبادت میں فوت ہو گئے اور اسی طرح ایک سال کھڑے رہے یہاں تک کہ دیمک نے عصا کو کھا لیا، تب آپ گر پڑے۔ اس قصہ کی کوئی اصلیت توریت میں نہیں ہے اور گو ابن جریر نے اسے حدیث مرفوع کے طور پر بیان کیا ہے مگر ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی صحت میں نظر ہے اور اسے غریب اور منکر کہا ہے۔ اور جنوں کو تو علم غیب کا دعویٰ تھا مگر کیا اس زمانہ میں انسان کو بھی سمجھ نہ آتا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، نہ پیشاب پاخانہ کے محتاج ہیں۔ پھر اس عرصہ میں امور مملکت کس طرح طے پاتے تھے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ تھے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت ان پر فرض تھی، امور سلطنت کو سرانجام دینا بھی ان کے ذمہ تھا۔ پھر عصا کے سہارے سے لاش کا کھڑا رہنا بھی قیاس میں نہیں آ سکتا سوائے اس کے کہ اسے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نعش مبارک کا ایک معجزہ بنا لیا جائے اور ایک نبی کی لاش کی یہ بے حرمتی ہے کہ ایک سال تک وہ دفن بھی نہ ہو۔ اور بظاہر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس مضمون کا یہاں کیا تعلق ہے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو اس کو اس موقعہ پر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پر اپنی نعمتوں کے ذکر کے بعد بتانا تو یہ چاہیے تھا جیسا کہ آگے سبا کے ذکر میں بتایا ہے کہ جب پچھلے لوگوں نے ناشکری کی تو اللہ تعالیٰ نے وہ نعمتیں چھین لیں۔ جن غیب جانتے تھے یا نہ جانتے

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾

سبا کے لیے ان کی سکونت کی جگہ میں ایک نشان تھا۔ دو باغ دائیں اور بائیں تھے۔ اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر کرو، اچھا شہر اور بخشنے والا رب ہے۔ (2686)

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾

تو انہوں نے منہ پھیر لیا سو ہم نے ان پر زور کا سیلاب بھیجا اور ان کے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ بدل دیئے جن میں تلخ میوے اور جھاؤ اور کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں۔ (2687)

تھے، اس کا یہاں کیا تعلق ہے اور جنوں کے سلیمان علیہ السلام کے ماتحت ہوتے ہوئے کون خیال کر سکتا تھا کہ جن علم غیب جانتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے جلد ہی بعد اس سلطنت کی حالت خراب ہوگئی۔ **حضرت سلیمان علیہ السلام کے بیٹے رحبعام** کے تخت نشین ہونے کے تھوڑی دیر بعد یربعام کی انگیخت پر بنی اسرائیل نے کچھ مطالبات پیش کیے۔ اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کے پرانے مشیروں نے رحبعام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ قوم کو تنگ نہ کرے اور ان کے مطالبات کو قبول کر لے۔ مگر اس نے بجائے ان مشیروں کی بات سننے کے اپنے نوجوان ساتھیوں کے کہنے پر بنی اسرائیل کے مطالبات کا سخت جواب دیا اور ان پر سختی کرنے کی ٹھانی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس قومیں باغی ہوگئیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت برباد ہوگئی۔ اور رحبعام کی حکومت صرف ایک چھوٹی سی شاخ پر رہ گئی (اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسرائیل قومیں بھی آزاد ہوگئیں) [دیکھو اسلاطین باب: 12]۔ پس ﴿دَآبَّةُ الْاَرْضِ﴾ یہی رحبعام حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیٹا ہے جس کی نظر صرف زمین تک محدود تھی اور سلیمان علیہ السلام کے عصا کا کھایا جانا اس کی سلطنت کی بربادی ہے۔ اور جنّ سے مراد غیر قومیں ہیں جنہوں نے اب تک بنی اسرائیل کی ماتحتی کا جوا اٹھایا ہوا تھا۔

2686- ﴿لِسَبَإٍ﴾ سَبَا کے لیے [دیکھو نمبر: 2463] اور یہاں مراد اس سے وہ قبائل ہیں جو سبا کی نسل سے تھے اور دائیں اور بائیں باغوں سے مراد یہ ہے کہ دائیں طرف بھی باغ ہی باغ تھے اور بائیں طرف بھی جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے۔ (ر) اور شہر کو طیب بلحاظ اس کی اعلیٰ درجہ کی آب وہوا کے کہا ہے۔ چونکہ سبا کا تعلق سلیمان علیہ السلام سے بھی تھا اس لیے اس ذکر کے بعد اس ذکر کو شروع کیا۔

2687- ﴿الْعَرِمِ﴾ عَرِمٌ۔ عُرَامٌ شدت اور کثرت کو کہتے ہیں اور [رَجُلٌ عَارِمٌ] خبیث اور شریر آدمی کو اور عَرِمٌ بند کو کہا جاتا ہے اور ان روکوں کو جو وادی کے درمیان میں بنائی جاتی ہیں تاکہ پانی روکا جائے۔ اور عَرِمٌ اس سیلاب کو کہتے ہیں جس کے سامنے کچھ

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَ هَلْ نُجٰزِيْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾

یہ سزا ہم نے انہیں دی اس لیے کہ انہوں نے ناشکری کی اور ہم ناشکر گزار ہی کو سزا دیتے ہیں۔

وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾

اور ہم نے ان میں اور ان بستیوں میں جن میں ہم نے برکت دی تھی نظر آنے والی بستیاں بنائی تھیں اور ہم نے ان میں سفر کا اندازہ کر دیا تھا، ان میں راتوں اور دنوں کو امن سے چلو۔ (2688)

ٹھہر نہ سکے اور سخت بارش کو بھی کہتے ہیں۔ (ل)

﴿خَمْطٍ﴾ ایک درخت ہے جس کا کانٹا نہیں یا اراک یعنی پیلو اور خَمْطَةٌ شراب کو کہا جاتا ہے جب تلخ ہو۔ (غ) اور زجاج کا قول ہے کہ ہر ایک سبزی کو کہا جاتا ہے جس کا مزہ تلخ ہو اور فراء کا قول ہے کہ پیلو کے پھل کو خَمْطٌ کہتے ہیں۔ (ل)

﴿اَثْلٍ﴾ اَثْلَةٌ کسی چیز کا اس کا اصل ہے۔ اور ﴿اَثْلٍ﴾ ایک درخت ہے جو طَرْفَاءٌ (جھاؤ) سے ملتا جلتا ہے مگر اس سے بڑا اور اچھا ہوتا ہے۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا منبر بنایا گیا تھا۔ (ل)

مارب کے بند کا ٹوٹنا:

اس قوم نے ایک بڑا بند لگا کر پہاڑوں کے پانی کا ذخیرہ بنایا ہوا تھا جس پر ان کی خوشحالی کا دارومدار تھا۔ مگر جب انہوں نے نعمائے الٰہی سے اعراض کیا تو یہی بند ٹوٹ کر ان کی تباہی کا موجب ہو گیا اور باغوں کی جگہ جنگل بن گئے۔ اس بند کا ٹوٹنا ایک تاریخی واقعہ ہے جو پہلی یا دوسری صدی عیسوی کا ہے۔ ان لوگوں کی طرف کسی نبی کے آنے کا ذکر یہاں نہیں ہے اور یہ زمانہ بھی فترت کا تھا۔ پس ان کا اعراض ان نعمتوں سے اعراض تھا جو ان کو دی گئیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نعمتوں کی قدر نہ کرنے پر بغیر انبیاء کے آنے کے بھی عذاب آ جاتا ہے۔ اور اگلی آیت میں ان کے کفر سے مراد بھی ناشکر گزاری ہے جس پر لفظ كَفُوْر بھی شاہد ہے۔ اور اس قوم کی تباہی کا واقعہ چونکہ قریب ترین واقعہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے تھا اس لیے اس کی طرف جہاں کفار کو توجہ دلائی ہے مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی ہے کہ اگر نعمتیں ملنے کے بعد ناشکر گزاری کریں گے تو مؤاخذہ کے نیچے بھی آئیں گے اور اس کے لیے کسی نئے رسول کے بھیجنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لیے کہ آنحضرت ﷺ کو ﴿كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ بھیجا گیا ہے۔ [دیکھو آیت: 28]

2688- ﴿ظَاهِرَةً﴾ ظَهَرَ کے معنی ہیں ایک چیز زمین کی پیٹھ پر نظر آ گئی۔ پس وہ مخفی نہ رہی۔ پھر اس کا استعمال ہر ایک چیز پر ہے جو آنکھ سے یا بصیرت سے نظر آ جائے۔ ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ﴾ [الأنعام: 151:6] ''جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں۔'' ﴿اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا﴾ [الكهف: 22:18] ''سوائے (اس کے کہ) ظاہر جھگڑا (ہو)۔'' ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

تو انہوں نے کہا اے ہمارے ربّ! ہمارے سفروں میں دوری ڈال دے اور اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ پس ہم نے انہیں افسانے بنا دیا اور انہیں ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس میں ہر ایک صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لیے نشان ہیں۔ (2689)

الدُّنْيَا﴾[الروم: 7:30] ''وہ دنیا کی زندگی کی ظاہر (باتوں) کو جانتے ہیں۔'' ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾[الروم: 41:30] ''خشکی اور تری میں فساد ظاہر ہو گیا۔'' میں ظَهَرَ سے مراد ہے بہت ہو گیا اور پھیل گیا اور ﴿نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً﴾[لقمان: 20:31] ''تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو پورا کیا ہے۔'' سے مراد ہے وہ نعمتیں جن سے ہم واقف ہیں اور وہ جن سے ہم واقف نہیں (اور اس سے مراد دنیوی اور دینی نعمتیں لینا زیادہ مناسب ہے) اور ﴿قُرًى ظَاهِرَةً﴾ میں ظاہر پر بھی حمل کیا گیا ہے کہ یہ بعض حالتوں کے لیے ایک مثال ہے۔ (غ) اور مفسرین نے یہاں کئی معنی کیے ہیں۔ ایک دوسرے سے اتنی قریب کہ ایک سے دوسری نظر آتی تھی یا بلند مقامات پر یا مشہور بستیاں۔ کیونکہ [هٰذَا اَمْرٌ ظَاهِرٌ] کہتے ہیں جب مراد ہو کہ یہ بات مشہور ہے یا شہروں سے باہر چھوٹی بستیاں۔ کیونکہ [ظَاهِرُ الْبَلَدْ] سے مراد ہوتی ہے شہر سے باہر۔ (ر) اور ﴿الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا﴾ سے مراد شام کی بستیاں ہیں بوجہ اپنے درختوں اور پھلوں کی کثرت کے اور اپنے اہل کی فراخی کے۔ (ر)

یہ بھی اہل سبا کا ذکر ہی ہے۔ **یمن اور شام میں بڑی بھاری تجارت تھی**۔ اصل میں یہ لوگ سمندر کے راستے ہندوستان اور دیگر ممالک سے تجارت کرتے تھے اور پھر ان تمام ممالک کی اشیاء کو لا کر شام میں پہنچاتے تھے۔ گویا تجارت کے لیے درمیانی بن کر دونوں طرف سے فائدہ اٹھاتے تھے اور تجارت سے دولت اور اس کے ساتھ آسائش میں ترقی ہوتی ہے، تب لوگ دنیا میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ میور کہتا ہے کہ یہ تجارت بہت رونق پر تھی اور اس سے یہ قوم بہت دولت مند ہو گئی تھی اور لکھتا ہے کہ حضر موت سے ایلہ تک اس وقت ستر منزلیں تھیں اور وہی آج بھی موجود ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان سب باتوں کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے سامانوں سے انسان جو کچھ بناتا یا حاصل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی اسے دیتا ہے۔ اور رات اور دن کو امن سے سفر کرنے کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر رستہ چلتا تھا کہ رات چلنے والوں کو بھی اس پر خطر نہ تھا۔

2689- ﴿رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا﴾ ہو سکتا ہے کہ زبان قال سے کہا اور ہو سکتا ہے کہ زبان حال سے کہا۔ (ر) اور دوسرے معنی زیادہ موزوں ہیں یعنی ان کی ناشکر گزاری زبان حال سے اپنی تجارت کی تباہی مانگنا تھی۔ ﴿فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ﴾ یعنی ان کے قصے باقی رہ گئے اور اس قوم کا نام و نشان مٹ گیا۔

وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور شیطان نے ان پر اپنا ظن سچ کر دکھایا، سو مومنوں کی ایک جماعت کے سوائے انہوں نے اس کی پیروی کی۔ (2690)

وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَ رَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾ ع

اور اسے ان پر کوئی غلبہ حاصل نہ تھا مگر یہ اس لیے ہوا کہ ہم اسے جو آخرت پر ایمان لاتا ہے اس سے الگ کر دیں جو اس کے بارے میں شک میں ہے۔ اور تیرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾

کہہ، ان کو بلاؤ جنہیں تم اللہ کے سوائے (معبود) سمجھتے ہو وہ ایک ذرہ کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان دونوں میں ان کی کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے اس کا کوئی مددگار ہے۔

وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾

اور اس کے ہاں شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی مگر اس کے لیے جس کے بارے میں وہ اجازت دے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جائے گی کہیں گے کیا ہے جو تمہارے رب نے کہا ہے؟ کہیں گے حق (فرمایا ہے) اور وہ بلند (اور) بڑا ہے۔ (2691)

2690- ﴿صَدَّقَ﴾ سے یہاں مراد ہے حَقَّقَ یا [وَجَدَ ظَنَّهُ صَادِقًا] یعنی ثابت کر دیا یا سچا پایا۔ (ر) اور ابلیس کا ظن یہی تھا کہ انسان میرے پیچھے لگ کر اور شہوات دنیوی میں منہمک ہو کر تباہ ہو جائیں گے۔ اور اگلی آیت میں صاف بتا دیا کہ ان لوگوں پر بھی **ابلیس کو سلطان یعنی تسلط حاصل نہ تھا** یعنی وہ خود اس کے پیچھے لگے۔ ورنہ شیطان کو کوئی ایسی طاقت نہیں دی گئی کہ وہ زبردست لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے۔

2691- اس آیت کے معنی میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ ان میں سے دو معنی سیاق کے لحاظ سے ہو سکتے ہیں یعنی ایک یہ کہ جس

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

کہہ، کون تمہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کہہ، اللہ۔ اور ہم یا تم سیدھے رستے پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں۔ (2692)

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَ لَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

کہہ، تم سے اس کے متعلق باز پرس نہ ہوگی جو ہم نے جرم کیا ہو اور ہم سے اس کے متعلق پرسش نہ ہوگی جو تم کرتے ہو۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾

کہہ، ہمارا رب ہمیں جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ اور وہ خوب فیصلہ کرنے والا جاننے والا ہے۔ (2693)

گھبراہٹ کے واقع ہونے اور دور ہونے کا ذکر ہے وہ قیامت کی گھبراہٹ ہے۔ اور ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ﴾ کہنے والے مشفوع ہیں اور ﴿الْحَقَّ﴾ کہنے والے شافع۔ اور الحق سے مراد اذن شفاعت ہے اور دوسرے یہ کہ یہ فترت کے بعد نزول وحی کے متعلق ہے اور اس کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ جب وحی کے نزول پر ایک لمبا زمانہ گزر گیا اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا نزول آنحضرت ﷺ پر ہوا تو ملائکہ سما نے خیال کیا کہ قیامت آ گئی ہے۔ پھر جب ان کا خوف دور ہوا تو بعض کہا کہ کیا حکم ہوا ہے تو دوسروں نے کہا ﴿الْحَقَّ﴾ یعنی وحی الٰہی کا نزول ہوا ہے۔ اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ﴿فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ﴾ میں اس گھبراہٹ کا دور ہونا مراد ہے جو قوم کی تباہی پر پیدا ہوتی ہے۔ یعنی قیامت وسطیٰ کے بعد اور مطلب یہ ہے کہ ان کی تباہی صرف مخالفت کی تباہی ہوگی اور آخر کار یہ لوگ حق کو پہچان لیں گے۔

2692- یہ لف ونشر مرتب ہے۔ اور معنی ظاہر ہیں کہ ایک گروہ اہل توحید کا ہے اور ایک اہل شرک کا۔ اب ظاہر ہے کہ ان میں سے ہدایت پر کون ہے اور گمراہی میں کون۔

2693- اللہ تعالیٰ کا سب کو جمع کرنا ایک تو قیامت کے دن ہے اور اسی دن سب فیصلے کھلے کھلے ہوں گے۔ لیکن جب ﴿مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى﴾ [السجدة: 21:32] ''نزدیک کے عذاب سے۔'' کے وعدے کھلے کھلے قرآن شریف میں موجود ہیں، جب کفار کی مسلمانوں پر چڑھائی اور ان کی شکست کا ذکر موجود ہے ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝﴾ [القمر: 45:54] ''(یہ) جمعیت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر دیں گے۔'' اور یہاں آگے [آیت نمبر: 29] میں سوال بھی موجود ہے ﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ جو وہ ہمیشہ اپنی ہلاکت کی پیشگوئیوں پر کرتے تھے، تو اس جمع کرنے سے مراد بھی اسی دنیا میں جمع کرنا ہے یعنی کسی میدان

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

کہہ، مجھے وہ دکھاؤ جنہیں تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ ملا رکھا ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہی اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (2694)

وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور ہم نے تجھے تمام ہی لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (2695)

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟ اگر تم سچے ہو۔

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّ لَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾

کہہ، تمہارے لیے ایک دن کی میعاد ہے اس سے تم ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ بڑھ سکتے ہو۔ (2696)

میں حریفوں کے طور پر ہر دو فریق کا لے آنا اور یہ مسلمانوں اور کفار کی **جنگوں کی طرف اشارہ** ہے۔

2694- ﴿اَرُوْنِيَ﴾ سے مراد یہاں دلائل سے دکھانا ہے اور ﴿الْعَزِيْزُ﴾ کے لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کا نام پھیلانے والے غالب ہوں گے اور بت تمہاری کچھ بھی امداد نہ کر سکیں گے۔

2695- **آنحضرت ﷺ کی رسالت عامہ اور ختم نبوت:** ﴿كَآفَّةً﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 267] اور یہاں اس لفظ کو اختیار کر کے یہ بتایا ہے کہ آپ کی رسالت عامہ سے اب کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا۔ گویا اس سے خروج سے روکا گیا ہے کیونکہ کَفّ کے معنی روکنا ہیں۔ یہ آیت بھی ختم نبوت پر دلیل ہے کیونکہ جب کوئی شخص اس رسالت سے باہر نہیں نکل سکتا تو اور رسول کی بھی ضرورت نہیں۔

2696- ہوسکتا ہے کہ میعاد یوم میں اشارہ یہ ہو کہ میرے چلے جانے کے بعد ایک دن کی میعاد ہوگی۔ جیسا دوسری جگہ ہے ﴿عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾﴾ [النمل: 72:27] ''شاید اس کا کچھ حصہ تم سے نزدیک ہی آ گیا ہو، جسے تم جلد چاہتے ہو'' اور دن سے مراد پیشگوئی میں ایک سال لیا جائے گا اور پہلا اجتماع مسلمانوں اور کفار کا ہجرت سے ایک سال گزر جانے کے بعد ہوا۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا کہتے ہیں ہم اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس پر جو اس سے پہلے ہے۔ اور اگر تو دیکھے جب ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے ایک دوسرے کی طرف بات لوٹائیں گے۔ جو کمزور تھے وہ انہیں جو بڑے تھے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾

جو بڑے تھے وہ انہیں جو کمزور تھے کہیں گے کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا تھا؟ اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آگئی، بلکہ تم خود مجرم تھے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور جو کمزور تھے وہ انہیں جو بڑے تھے کہیں گے بلکہ (یہ تمہاری) رات اور دن کی تدبیریں (تھیں) جب تم ہمیں کہتے تھے کہ ہم اللہ کا انکار کریں اور اس کے شریک ٹھہرائیں اور جب عذاب دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے۔ اور جو کفر کرتے ہیں ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں ان کو بدلہ نہیں ملے گا، مگر اسی کا جو وہ کرتے تھے۔ (2697)

2697- اسرار ندامت سے مراد اس کا اظہار بھی لیا گیا ہے [دیکھو نمبر: 1408] اور زنجیروں کے گردنوں میں ہونے پر [دیکھو نمبر: 1599]۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا، مگر اس کے آسودہ حال لوگوں نے کہا جو تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔

وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور کہتے ہیں ہم مال اور اولاد میں بڑھ کر ہیں اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

کہہ، میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَ مَآ اَمْوَالُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۪ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور نہ تمہارے مال اور نہ تمہاری اولاد وہ چیز ہے جو مرتبہ میں تمہیں ہمارے قریب کرے مگر جو ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو ان کے لیے ان کے عمل کا دو چند اجر ہے اور وہ بلند مقامات میں امن میں ہوں گے۔

وَ الَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور جو لوگ ہماری آیتوں کو ہرانے کی کوشش کرتے ہیں وہ عذاب میں حاضر کیے جائیں گے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ

کہہ، میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے رزق کی کشائش دیتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) اس کے لیے تنگ کرتا ہے۔ اور جو چیز تم خرچ کرو وہ اس کا بدلہ دیتا ہے

وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔[2698]

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں کو کہے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؟[2699]

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾

کہیں گے، تو پاک ہے تو ہمارا کارساز ہے نہ یہ۔ بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر ان پر ایمان لانے والے تھے۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾

سو آج تم میں سے کوئی دوسرے کے لیے نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ نقصان کا اور جو ظلم کرتے تھے ہم انہیں کہیں گے آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے۔

2698- ﴿يُخْلِفُ﴾ اَخْلَفَ کے معنی وعدہ کا خلاف کیا بھی آتے ہیں ﴿بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ﴾[التوبة: 77:9] ''انہوں نے اللہ سے اس کے خلاف کیا جو اس سے وعدہ کیا تھا۔'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾[آل عمران: 9:3] ''بے شک اللہ وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔'' اور اِخْلَافٌ کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک دوسرے کے بعد پانی پلائے اور درخت کے پتے جھڑ جانے کے بعد پھر سرسبز ہو جائے تو کہا جاتا ہے [اَخْلَفَ الشَّجَرُ] اور [اَخْلَفَ اللّٰهُ عَلَيْكَ] اس کے متعلق کہا جاتا ہے جس کا مال جاتا رہے اور اس سے مراد ہوتی ہے کہ تجھے بدلہ دے۔ (غ)

2699- اس لیے کہ مشرک ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے اور انہیں دیویاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے۔ اگلی آیت میں جواب مذکور ہے کہ یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں یعنی **شیاطین کی عبادت** کرتے تھے کیونکہ انہی راہوں پر چلتے تھے جن پر شیطان چلاتا تھا۔ اسی ذیل میں وہ سب لوگ آتے ہیں جو نیک بندوں کو خدا بناتے ہیں جیسے **پرستاران مسیح**۔ یہ لوگ فی الحقیقت انہیں معبود نہیں بناتے کیونکہ ان کی بتائی ہوئی راہوں پر نہیں چلتے بلکہ جنوں یا شیاطین یا اپنی خواہشات کو اپنا معبود بناتے ہیں۔ کیونکہ انہی کے پیچھے لگتے ہیں۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾

اور جب اُن پر ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، کہتے ہیں یہ صرف ایک (ایسا) شخص ہے جو چاہتا ہے کہ تمہیں ان سے روک دے جس کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے تھے اور کہتے ہیں یہ صرف بنایا ہوا جھوٹ ہے اور کافر حق کے بارے میں جب وہ ان کے پاس آگیا، کہتے ہیں یہ تو کھلا جادو ہے۔

وَ مَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَ مَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ؕ ﴿۴۴﴾

اور ہم نے انہیں کوئی کتابیں نہیں دیں جنہیں وہ پڑھتے ہوں اور ہم نے تجھ سے پہلے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا۔

وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

اور انہوں نے (بھی) جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے اور یہ اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے جو ہم نے انہیں دیا تھا۔ سو انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا، پس میری ناپسندیدگی کیسی تھی۔ (2700)

2700- ﴿مِعْشَارَ﴾ کسی چیز کے عشر یعنی دسویں حصہ کو کہتے ہیں۔ (غ) اور مراد تقلیل میں مبالغہ ہے۔ (ر)

واقعی عرب کے لوگ سامان دنیا کے لحاظ سے بعض پہلی قوموں کے مقابل پر کچھ بھی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے بھی جب جھٹلایا تو ان کی طاقت دنیوی انہیں اللہ تعالیٰ کی سزا سے نہ بچا سکی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مال اور اولاد پر کیا فخر کرتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک کرنا چاہتا ہے تو بڑے بڑے جبار بھی اس کے سامنے یوں گر جاتے ہیں کہ ان کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۛ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَىْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾

کہہ، میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ پھر غور کرو کہ تمہارے ساتھی کو کچھ جنون نہیں۔ وہ صرف تمہیں سخت عذاب سے پہلے ڈرانے والا ہے۔(2701)

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾

کہہ، جو میں تم سے اجر مانگتا ہوں وہ تمہارے لیے ہی ہے۔ میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔(2702)

قُلْ اِنَّ رَبِّىْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾

کہہ، میرا رب حق فرماتا ہے۔ وہ غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔(2703)

2701- تنہائی میں انسان کو غور کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ایک ایک، دو دو ہو کر اس معاملہ پر غور کرو۔ مجنون انسان کو دنیا کی بہتری کی فکر نہیں ہو سکتی۔ وہ تو اپنی بہتری بھی نہیں سوچ سکتا، دوسروں کی کیا سوچے گا۔

2702- اجر تو آپ کوئی مانگتے ہی نہ تھے ﴿اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾۔ پس یہاں اجر سے مراد صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں کرنے کو کہتا ہوں وہ صرف تمہاری بھلائی کے لیے ہے۔

2703- ﴿قَذَفَ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 2062] اور یہاں مراد [قَذَفَ بِالْحَقِّ] سے صرف رمی یعنی پھینکنا ہے۔ اور اگر دور پھینکنا مراد لیا جائے تو اشارہ اس کے اطراف و اکناف عالم میں اشاعت کی طرف ہے۔ (ر) یا اس لفظ کے اختیار کرنے میں اشارہ ایک دور افتادہ مخلوق کی طرف ہے جو حق سے بہت دور پڑی ہوئی تھی۔ اور حَقّ سے مراد یہاں وحی یا قرآن کریم ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ معنی بھی مروی ہیں کہ حق کو باطل پر پھینکتا ہے۔ (ر) اس صورت میں علام الغیوب میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے کہ باطل حق کے سامنے نابود ہو جائے گا۔ جیسا دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ [الأنبیآء: 18:21] ''سو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے پس ناگہاں وہ نابود ہو جاتا ہے۔'' اور اگلی آیت میں بھی اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾

کہہ، حق آ گیا اور باطل نہ (کسی امر کی) ابتدا کر سکتا ہے اور نہ لوٹا سکتا ہے۔ (2704)

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَ اِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾

کہہ، اگر میں گمراہ ہوں تو میری گمراہی اپنی ہی جان پر ہے۔ اور اگر میں سیدھے راہ پر ہوں تو اس کی وجہ سے ہے جو میرا رب میری طرف وحی کرتا ہے۔ وہ سننے والا قریب ہے۔

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ۙ

اور کاش تو دیکھتا جب گھبرا اٹھیں گے تو (اس وقت) بچ نہ سکیں گے اور نزدیک مکان سے پکڑے جائیں گے۔ (2705)

وَّ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ۚ

اور کہیں گے ہم اس پر ایمان لائے اور ان کے لیے دور جگہ سے (ایمان کا) پالینا کہاں (ممکن) ہے۔ (2706)

2704- دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ...﴾ [بنی إسرائیل: 81:17] ''کہہ حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا۔۔۔'' اور یہاں اس باطل کے نابود ہونے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے ﴿مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيْدُ﴾ یعنی اس کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ اور یہ محاورہ قبیلہ کی ہلاکت سے ماخوذ ہے، کیونکہ جب وہ ہلاک ہو جائے تو اس کے لیے نہ کسی امر میں ابتدا کرنا باقی رہتا ہے نہ اس کا اعادہ کرنا۔ (ر) اور باطل سے مراد یہاں کفر و شرک ہے۔

2705- ﴿فَوْتَ﴾ [دیکھو نمبر: 544] یہاں مراد ہے [لَا يَفُوْتُوْنَ] اس سے یعنی اللہ تعالیٰ کی گرفت سے دور نہ ہو سکیں گے یا بچ نہ سکیں گے۔ اور ﴿مَّكَانٍ قَرِيْبٍ﴾ سے پکڑا جانے سے مراد یہاں عذاب دنیا کا آنا ہے۔ اور ابن زید نے اس میں بدر کی طرف اشارہ لیا ہے۔ (ج)

2706- ﴿التَّنَاوُشُ﴾ نَوْشٌ اور تَنَاوُشٌ کے معنی تَنَاوُلٌ ہیں یعنی ایک چیز کا پالینا۔ اور مطلب یہ ہے کہ ایک اور جگہ سے (یعنی موت کے بعد) ایمان کا پالینا کس طرح ممکن ہے اور جب قریب مکان (یعنی اس دنیا میں) تھے تو اس وقت ایمان نہ لاتے تھے۔ یعنی جب ان کے اختیار میں تھا۔ (غ) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر رجوع الی الدنیا مراد ہے۔ (ر) مراد وہی لوگ ہیں جو عذاب میں گرفتار ہو کر مارے گئے کہ مرنے کے بعد وہ چاہیں گے کہ ایمان لائیں اور اگلی آیت ﴿وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ

وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾

اور اس کا پہلے انکار کر دیا اور دور جگہ سے بن دیکھے (اٹکل پچو) باتیں کرتے ہیں۔ (2707)

وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

اور ان کے اور ان کی خواہشوں کے درمیان ایک روک ڈال دی جائے جس طرح پہلے ان جیسے لوگوں سے کیا گیا۔ وہ بے چین کر دینے والے شک میں تھے۔ (2708)

قَبْلُ﴾ میں اس دنیا میں کفر کرنے کا ذکر ہے۔

2707- یہاں ان کے اس دنیا میں کفر اور تک بازیوں کا ذکر ہے اور مکان بعید سے مراد یہاں معقولی رنگ میں بعید ہونا مراد ہے۔

2708- ﴿مَا يَشْتَهُوْنَ﴾ سے مراد آیات بالا کے لحاظ سے رجوع الی الدنیا یا ایمان یا طاعت وغیرہ مفسرین نے لیا ہے۔ (ر) مگر وہ چیز جسے کفار چاہتے ہیں وہ اغراض دنیوی ہیں ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ﴾ [آل عمران: 14:3] ''لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے (جیسے) عورتیں اور بیٹے اور ڈھیروں ڈھیر۔'' پس مراد یہ ہے کہ وہ عذاب جو ان کی موت کا موجب ہوگا ان کی محبوب چیزوں کو ان سے دور کر دے گا۔ یا ﴿مَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ سے مراد حق کو نابود کرنے کی خواہش ہے کہ وہ پوری نہ ہوگی اور وہ ناکام رہیں گے۔ اور مجاہد نے ﴿مَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ سے مراد مال اور دنیا کی آسائشیں ہی لی ہیں۔ (ج)

سورۃ فاطر

نام:

اس سورت کا نام فَاطِر ہے اور ملائکہ بھی اس کا نام ہے اور اس میں 5 رکوع اور 45 آیتیں ہیں اور اس کے نام فَاطِر میں جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یہ اشارہ ہے کہ وہ خدا جس نے فطرت انسانی کو بنا کر خدا سے ملنے کی تڑپ اس میں رکھی ہے اس تڑپ کے پورا کرنے کا سامان بھی دیا ہے۔ اس لیے اس کا مضمون بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت روحانی ہی ہے۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی دونوں قسم کی نعمتوں یعنی نعمائے جسمانی و روحانی کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ شیطان نعمائے روحانی سے انسان کو محروم کر کے اسے دکھ کی طرف لے جاتا ہے۔

② دوسرے رکوع میں بتایا ہے کہ انسان کو عزت صرف تعلق باللہ سے ملتی ہے۔

③ تیسرے میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت روحانی کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں کے اندر رسول بھیج کر ان کی ربوبیت روحانی کی۔

④ چوتھے میں بتایا کہ اختلاف تمام عالم میں ہے اس لیے انسانوں میں ان نعمائے روحانی کے لینے میں اور ان سے فائدہ اٹھانے میں بھی اختلاف مراتب ہے۔ یہاں تک کہ وہ برگزیدہ لوگ جنہیں اب وارث کتاب اللہ بنایا جاتا ہے وہ بھی سب یکساں نہیں۔

⑤ پانچویں میں بتایا کہ نعمائے روحانی کے انکار سے انسان خود ہی دکھ میں مبتلا ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ بڑا بردبار ہے، ہر ظلم پر فوراً گرفت نہیں کرتا بلکہ ایک وقت تک مہلت بھی دیتا ہے۔

تعلق:

پچھلی سورت میں مسلمانوں پر اپنے انعامات کا ذکر دوسرے لوگوں کے ذکر میں کیا تھا۔ یہاں بتایا ہے کہ وہ خدا جو جسمانی طور پر لوگوں کی ربوبیت فرماتا ہے روحانی طور پر بھی فرماتا ہے اور تمام امتوں میں رسول بھیجنے کے بعد اب اس نے اپنی روحانی نعمت کتاب اللہ کا وارث امت محمدیہ کو بنایا ہے۔

زمانۂ نزول:

سورت مکی ہے اور زمانہ نزول وہی معلوم ہوتا ہے جو پچھلی سورت کا ہے۔

اٰيَاتُهَا 45 (35) سُوْرَةُ فَاطِرٍ مَّكِّيَّةٌ (43) رُكُوْعَاتُهَا 5

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①

سب تعریف اللہ کے لیے ہے (جو) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (اور) فرشتوں کو رسول بنانے والا (جو) دو دو اور تین تین اور چار چار بازوؤں والے (ہیں) وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے بڑھاتا ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (2709)

2709- ﴿اَجْنِحَةٍ﴾ جَنَاحٌ کی جمع ہے۔ پرند کے بازوؤں کو اور کسی چیز کے دو جانبوں کو اس کے دو جناح کہا جاتا ہے۔ (غ) اور انسان کے بازو کو بھی جناح کہا جاتا ہے اور سارے ہاتھ کو بھی۔ اور حدیث میں ہے [وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ] (سنن أبی داؤد، کتاب العلم، باب الْحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ: 3643) جس کے معنی کئے گئے ہیں کہ فرشتے اپنے پر طالب علم کے لیے بچھا دیتے ہیں جب وہ چلتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کا اس کی تعظیم کے لیے تواضع کرنا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد علمی مجالس میں ان کا نزول ہے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد ان کے اظلال ہیں اور جناح میں عربی میں بہت سی مثالیں ہیں۔ (ل)

فرشتوں کی رسالت دو طرح پر ہے:

ایک امور جسمانی میں ایک امور روحانی میں۔ وہ مدبرات امور جسمانی بھی ہیں یعنی وسائط جن کے ذریعہ سے نظم عالم جسمانی قائم ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کا کلام اس کے خاص بندوں یعنی اس کے انبیاء کو پہنچانے والے بھی ہیں اور یہاں فَاطِرٌ کا لفظ اختیار کرنے میں خصوصیت سے اشارہ اسی کی طرف ہے کہ وہ خدا جس نے فطرت انسانی کے اندر ایک پیاس رکھی ہے کہ کسی ہستی بالا سے تعلق پیدا کرے، اس نے لازماً اس فطرت کی پیاس کے بجھانے کا سامان بھی دیا ہے۔ اس لیے فاطر کے ساتھ ہی ملائکہ کی رسالت کا ذکر کیا۔

فرشتوں کے بازو:

اور فرشتوں کو ﴿اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ﴾ کہا ہے اور جناح پرند میں پر ہیں جس سے وہ پرواز کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتا ہے۔ اور انسان میں اس کا ہاتھ یا بازو ہے جس کی مدد سے وہ کام کرتا ہے پر نہیں۔ پس فرشتہ کا جناح اپنے رنگ کا ہوگا اس کی کیفیت

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲

اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھولے تو اس کو بند کرنے والا کوئی نہیں اور جسے وہ بند کردے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں۔ اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ (2710)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳

اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کیا اللہ کے سوائے کوئی اور پیدا کرنے والا تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، سو تم کہاں الٹے پھرے جاتے ہو۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۴

اور اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو تجھ سے پہلے رسول (بھی) جھٹلائے گئے اور اللہ کی طرف ہی (سب) کام لوٹائے جاتے ہیں۔

کو ہم نہیں جان سکتے کیونکہ وہ جسم نہیں جسے ہم دیکھ سکیں۔ [اِنَّا لَا نَعْرِفُ حَقِيْقَتِهٖ وَ كَيْفِيَّتِهٖ] (ر) اور جو لوگ فرشتوں کے پرندوں جیسے پر سمجھتے ہیں وہ غلطی کھاتے ہیں۔ اور ﴿مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ﴾ کو بعض نے يُرْسِلُوْنَ محذوف قرار دے کر اس کے متعلق مانا ہے۔ (ر) یعنی فرشتے دو دو، تین تین، چار چار بھیجے جاتے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ﴿اَجْنِحَةٍ﴾ کی صفت ہے یعنی فرشتوں میں بھی تفاوت ہے سب فرشتے یکساں نہیں۔ بعض دو جناح والے ہیں، بعض تین جناح والے، بعض چار جناح والے اور ﴿يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ بعض کے جناح اس سے بھی زیادہ ہیں چنانچہ حدیث متفق علیہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا اور اس کے چھ سو جناح تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جس طرح انسان کی طاقت اس کے بازو سے ہے اسی طرح جن ملائکہ کے جناح زیادہ ہیں وہ زیادہ قوت اور طاقت والے ہیں۔ اور یہاں اس ذکر کی غرض اللہ تعالیٰ کی نعمائے جسمانی اور روحانی کی طرف توجہ دلانا ہے۔

2710- یعنی جن نعمتوں کو اللہ تعالیٰ نے پہنچانے کا سامان کیا ہے ان کو کوئی روک نہیں سکتا اور اشارہ اللہ تعالیٰ کی نعمائے روحانی کی طرف ہے۔ جس حق کو اللہ تعالیٰ پہنچانا چاہتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا، جیسا کہ [آیت: 4] میں تکذیب کا ذکر کرکے اس کا انجام بتادیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵

اے لوگو! اللہ کا وعدہ سچا ہے سو تمہیں دنیا کی زندگی دھوکا نہ دے اور نہ بڑا دھوکا دینے والا تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۶

شیطان تمہارا دشمن ہے سو اسے دشمن سمجھو۔ وہ صرف اپنے گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ جلتی ہوئی آگ کے رہنے والوں میں سے ہوں۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷ ع 1 7 13

جو کافر ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اور جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۸

تو کیا وہ شخص جسے اس کا برا عمل بھلا معلوم ہوتا ہے اور وہ اسے اچھا سمجھتا ہے (ہدایت پا سکتا ہے)۔ سو اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ پس تیری جان ان پر افسوس کرتے ہوئے ہلاک نہ ہو جائے۔ اللہ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (2711)

2711- ﴿تَذْهَبْ نَفْسُكَ﴾ ذَهَبَ کے لیے [دیکھو نمبر: 2080] اور یہاں جان کے جانے سے مراد موت ہے۔ (غ)

جب انسان گمراہی میں یہاں تک دور نکل جائے کہ بدی کو اچھا سمجھے تو اس کا ہدایت پانا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہی حالت عرب کی بحیثیت قوم ہو چکی تھی کہ وہ بدیوں پر علانیہ فخر کرتے تھے اور انہیں اچھا سمجھ کر کرتے تھے۔ یہ حالت **اخلاقی موت** کی ہے اور اس وقت یہ حالت عرب کی ہی نہیں بلکہ کل عالم کی ہو چکی تھی۔ ایسے لوگوں کے لیے نبی کریم ﷺ کا دل رنج سے پگھلتا تھا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [الشعرآء: 3:26] ''شاید تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔'' آپ کے قلب کا یہ درد ہی تھا جس نے آخر کار ایسے سخت دلوں کو بھی موم کر دیا۔

وَ اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹

اور اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے سو وہ بادل کو اٹھاتی ہیں۔ پس ہم اسے ایک مردہ شہر کی طرف چلاتے ہیں، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں اسی طرح جی اٹھنا ہے۔ (2712)

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا ؕ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَمْكُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ یَبُوْرُ ۝۱۰

جو کوئی عزت چاہتا ہے تو سب عزت اللہ کے لیے ہی ہے، اسی کی طرف پاک کلمے چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتا ہے۔ اور جو لوگ بری مخفی تدبیریں کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی مخفی تدبیر ملیا میٹ ہو جائے گی۔ (2713)

2712- اس نشور سے اس **قیامت روحانی** کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو نبی کریم ﷺ کے درد دل سے برپا ہونے والی تھی۔ کیونکہ آسمانی پانی وحی کی جگہ ہے اور مردہ زمین سے مردہ دلوں کا ذکر مقصود ہے۔ اور مردہ زمین کا آسمانی پانی سے زندہ ہونا بتاتا ہے کہ مردہ دل وحی الٰہی کی تاثیر سے زندہ ہو جائیں گے۔ اور ﴿كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ﴾ میں اگر نشور سے مراد قیامت کبریٰ ہی لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح نبی کریم ﷺ کی وحی کے طفیل ایک قیامت روحانی برپا ہوگی اور اسی کا ذکر بادل کے آنے اور مردہ زمین کے زندہ ہونے میں ہے، اسی طرح قیامت کبریٰ بھی ہو کر رہے گی۔

2713- عزت وہ حالت ہے جو انسان کو مغلوب ہونے سے بچانے والی ہو [دیکھو نمبر: 265]۔ پس بتایا کہ ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے عزت حاصل ہو اور وہ ذلت کی حالت سے بچے، تو **عزت کا اصل سرچشمہ** العزیز خدا ہی ہے جو سب غالبوں پر غالب ہے۔ پس اس سے تعلق پیدا کرے اور اس کے لیے دو طریق بتائے۔ ایک کلمہ طیب یا پاکیزہ کلمات جس سے مراد ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ لیا گیا ہے یعنی توحید الٰہی کا قائل ہو اور یہ تمام پاکیزہ کلمات کی جڑ ہے اور دوسرے **اعمال صالحہ**۔ بالفاظ دیگر انسان اچھی باتوں کا قائل ہو اور پھر اپنے قول کو عمل میں لانے والا ہو تو اسے رفع ملتا ہے یعنی وہ قرب الٰہی حاصل کرتا ہے (رفع کے لیے [دیکھو نمبر: 445]) اور کلمات کے متعلق فرمایا کہ وہ چڑھتے ہیں اور عمل صالح کے متعلق فرمایا کہ وہ انسان کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ اقرار توحید کو بھی اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے، لیکن مراتب بلند اور اللہ تعالیٰ کا قرب صرف اقرار توحید سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ اعمال صالحہ سے۔ اور ﴿یَرْفَعُهٗ﴾ میں بعض نے مراد لیا ہے کہ اچھے عمل پاک کلمات کو بلند کرتے ہیں اور بعض نے یہ کہ پاک

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر تمہیں جوڑے بنایا۔ اور کوئی عورت حمل میں نہیں لیتی اور نہ جنتی مگر اسے علم ہوتا ہے، اور کسی عمر والے کو عمر نہیں دی جاتی او رنہ کسی کی عمر کم ہوتی ہے مگر یہ (سب کچھ) ایک کتاب میں ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔

وَ مَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖۗ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَ مِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور دو دریا برابر نہیں۔ یہ میٹھا ہے خوش ذائقہ، اس کا پینا خوشگوار ہے اور یہ کھاری ہے کڑوا۔[2713] اور ہر ایک سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو اور زیور نکالتے ہو، جسے تم پہنتے ہو۔ اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ اسے پھاڑتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔[2714]

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ۖۗ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے۔ ہر ایک ایک وقت مقرر کے لیے چلتا ہے۔ یہ اللہ تمہارا رب ہے، اسی کی بادشاہت ہے۔ اور وہ جنہیں تم اس کے سوائے

کلمات عمل صالح کو بلند کرتے ہیں اور ضمیر عمل صالح کرنے والی کی طرف بھی جاسکتی ہے۔ اور آیت کے دوسرے حصہ میں بتایا کہ جو لوگ اللہ سے تعلق پیدا کرنے والوں کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں ان کی تدابیر ناکام ہوں گی۔

2713- ﴿مِلْحٌ﴾ اس پانی کو کہتے ہیں جس کا مزہ بدل کر کھاری ہو گیا ہو۔ (غ) اور نمک کو بھی کہتے ہیں۔

2714- [آیت:11] کے مضمون کے لیے [دیکھو نمبر: 1602] اور اس آیت کے مضمون کے لیے [دیکھو نمبر: 2386 و 1724]۔

دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿۱۳﴾

پکارتے ہو وہ ایک ذرہ بھر اختیار نہیں رکھتے۔ (2715)

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾ ع

اگر تم انہیں بلاؤ تو وہ تمہاری پکار کو نہیں سنتے اور اگر سنیں تو تمہاری بات کو قبول نہ کر سکیں۔ اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کریں گے اور (خدائے) باخبر کی طرح کوئی تجھے خبر نہ دے گا۔ (2716)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾

اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ۚ

اگر چاہے تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔

وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾

اور یہ اللہ پر مشکل نہیں۔

وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور اگر کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنے بوجھ (کے ہٹانے) کے لیے بلائے اس (کے بوجھ) میں سے کچھ نہ اٹھایا جائے گا، اگرچہ قریبی ہو۔ تو صرف انہیں ڈراتا ہے جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں،

2715- ﴿قِطْمِيْرٍ﴾ کھجور کی گٹھلی میں ننھے گڑھے کو کہتے ہیں اور وہ نہایت قلیل شے کے لیے بطور مثال بولا جاتا ہے۔ (غ) اور بعض کے نزدیک کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کو کہا جاتا ہے۔

2716- یہاں پہلے حصہ میں کہ تمہاری پکار کو نہیں سنتے بت بھی مراد ہو سکتے ہیں اور انسان بھی جو گزر چکے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اور دوسرے معنی موقعہ کے لحاظ سے انسب ہیں، اس لیے کہ دوسرے حصہ آیت میں ہے کہ اگر وہ تمہاری پکار کو سنیں بھی تو قبول نہیں کر سکتے اور آخر پر قیامت کے دن انکار کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ یہ انسان یا ملائکہ ہیں جن کی لوگ عبادت کرتے ہیں۔

وَ مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

اور جو کوئی اپنے آپ کو پاک کرتا ہے تو اپنی ہی جان (کی بھلائی) کے لیے پاک کرتا ہے۔ اور اللہ کی طرف ہی پھر کر جانا ہے۔ (2717)

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾

اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں۔

وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾

اور نہ اندھیرا اور روشنی۔

وَ لَا الظِّلُّ وَ لَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾

اور نہ سایہ اور دھوپ۔ (2718)

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾

اور نہ ہی زندے اور مُردے برابر ہیں۔ اللہ (تعالیٰ) جسے چاہتا ہے سناتا ہے اور تو انہیں سنانے والا نہیں جو قبروں میں ہیں۔ (2719)

2717- ﴿مُثْقَلَةٌ﴾ اَثْقَلَهٗ کے معنی ہیں اسے بوجھ کے نیچے دبا دیا ﴿فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝﴾ [الطور: 40:52] ''تو یہ چٹی کے بوجھ میں دبے ہوئے ہیں۔'' اور ﴿مُثْقَلَةٌ﴾ وہ ہے جو اس طرح دبا ہوا ہو۔ (ل) اور مراد گناہوں کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ کیونکہ ثِقل ذنب کو بھی کہتے ہیں۔

2718- ﴿الْحَرُوْرُ﴾ حرّ اور حَرَارَةٌ گرمی ہے ﴿لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا﴾ [التوبة: 81:9] ''گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دوزخ کی آگ گرمی میں بہت بڑھ کر ہے۔'' اور حَرُوْرٌ گرم ہوا۔ (گ)

2719- آیت 19 سے لے کر 22 تک میں **نیکی اور بدی** یا ان کے کرنے والوں کا مقابلہ کیا ہے۔ جو پہلی اور آخری آیت میں نیکی اور بدی کا کرنے والے ہیں جنہیں پہلے اندھے کہا ہے انہی کو یہاں مردے کہا ہے اور جنہیں پہلے دیکھنے والا قرار دیا ہے انہیں یہاں زندہ کہا ہے اور درمیانی دو آیتوں میں نیکی اور بدی کا مقابلہ ہے۔ بدی کو پہلے اندھیرا اور پھر دھوپ کہا ہے اور نیکی کو پہلے نور اور پھر سایہ کہا ہے۔ گویا بدی باوجود اندھیرے کے گرمی کی شدت کے لیے ہوئی ہے اور نیکی باوجود نور اور روشنی ہونے کے سایہ کی ٹھنڈک اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور ترتیب پہلی دو آیتوں میں ایک ہے اور پچھلی دو میں بدل دی ہے۔ اور ہر ایک کے پہلے لَا لانا عربی زبان کی خاص ترکیب ہے اور نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ تکرار کے قائمقام ہے۔ گویا اصل ترکیب یوں ہے [وَ لَا الظُّلُمٰتُ وَ لَا النُّوْرُ، وَ لَا النُّوْرُ وَ لَا الظُّلُمٰتُ] اور مقابل کے لفظ کو چھوڑ دیا ہے۔

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾

تو صرف ڈرانے والا ہے۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ؕ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾

ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا۔ (2720)

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۲۵﴾

اور اگر تجھے جھٹلائیں تو انہوں نے بھی (اپنے رسولوں کو) کو جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے ان کے رسول ان کے پاس کھلی دلیلوں اور صحیفوں اور روشن کرنے والی کتاب کے ساتھ آئے۔

یہاں پر مفسرین نے بھی قبول کیا ہے کہ ﴿مَنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ سے مراد کفر پر اصرار کرنے والے ہیں۔ [تَرْشِيْحُ تَمْثِيْلُ الْمُصَرِّيْنَ عَلَى الْكُفْرِ بِالْاَمْوَاتِ] لیکن ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ میں یہ خوش خبری دے دی ہے کہ جو کام بشر کی طاقت سے نہیں ہوسکتا وہ الٰہی طاقت کر دکھائے گی۔

2720- جب آنحضرت ﷺ کے کام کا ذکر کیا کہ بدی کے بدانجام سے آپ ڈراتے ہیں اور لوگوں کو راہ راست پر لاتے ہیں اور مردوں کو زندگی اور اندھوں کو بصارت دیتے ہیں تو ساتھ ہی بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون یعنی ایسے لوگوں کا آنا کوئی نیا قانون نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں میں رسول آتے رہے، یہاں تک کہ کوئی قوم رسول سے خالی نہیں گزری۔ یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں سب سے پہلے زمانہ کی۔ جس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیم کی یہ وسعت کہ تمام قوموں میں نبی آتے رہے کوئی بعد کا خیال نہیں اور نہ یہاں کوئی تدریجی ترقی ہے۔ بلکہ ابتدا سے اسلام کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی گئی جس کا ذکر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴾ میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمام قوموں کی ربوبیت روحانی پہلے الگ الگ رسولوں کے ذریعے سے فرماتا رہا۔ اب تمام قوموں کو ایک رسول کے ہاتھ پر جمع کرنا چاہتا ہے، جس کی طرف [آیت: 31] میں اشارہ ہے تاکہ قومی نفاق اور بغض دور ہوں۔ پس مذہبی عداوتوں کو دور کرنے کے لیے یہ اصول قائم کیا کہ تمام مذاہب کی اصل بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، بعد میں ان غلطیوں کا پیدا ہوجانا اور بات ہے۔ نظام مذہب جو اسلام نے شروع سے بتایا ہے وہ اپنے اندر ایک علمی رنگ رکھتا ہے۔ اگر مذہب انسانوں کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کو پورا کرنا ضروری سمجھا تو اس کا نظام شروع سے ایک ہونا چاہیے۔ یہی اصول ﴿اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾﴾ میں قائم کیا ہے اور خود اس اصول کو قائم کر کے ان مذاہب باطلہ کا رد کیا ہے۔ جو ساری دنیا میں خدا کا قانون یکساں جاری نہیں سمجھتے جس کی بدترین مثال عیسائی مذہب ہے، جو پہلے تو خدا کی وحی کو ایک خاص

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٢٦﴾ ع 3 12 15

پھر میں نے انہیں پکڑا جنہوں نے کفر کیا، سو میری ناپسندیدگی کیسی تھی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿٢٧﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل سے پانی اتارتا ہے، پھر ہم اس کے ساتھ پھل نکالتے ہیں جو مختلف قسموں کے ہیں اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ خطے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں اور (بعض) نہایت سیاہ ہیں۔ (2721)

وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ

اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چارپایوں کے

گھرانہ یعنی بنی اسرائیل سے مخصوص کرتا ہے، پھر وہاں بھی ایک عرصہ دراز تک پیغمبر اور شرائع بھیج کر آخر خدا کو پتہ لگتا ہے کہ شرائع کا بھیجنا فضول تھا۔ انسان ان پر عمل نہیں کرسکتا، خدا کا بیٹا کفارہ ہوتو کام بن سکتا ہے۔

2721- ﴿جُدَدٌ﴾ جَدّ ہموار زمین کا قطع کرنا ہے اور اسی سے [جَدَّ فِيْ سَيْرِهٖ] یا [جَدَّ فِيْ اَمْرِهٖ] اور [ثَوْبٌ جَدِيْدٌ] کا اصل بھی اسی سے ہے یعنی مراد اس سے مقطوع یا قطع ہوا لباس ہے (کیونکہ قطع کرکے نیا لباس بنتا ہے)۔ پھر ہر چیز جو نئی پیدا ہوا سے جَدِيْدٌ کہا جاتا ہے۔ ﴿بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿١٥﴾﴾ [قٓ: 15:50] ''بلکہ وہ نئی پیدائش کے متعلق شبہ میں ہیں۔'' اور جَدَدُ جَدَّةٌ کی جمع ہے جس سے مراد کھلا رستہ ہے کیونکہ [طَرِيْقٌ مَّجْدُوْدٌ] اس رستہ کو کہا جاتا ہے جس پر چلا جائے اور اسے قطع کیا جائے اور اسی سے جَادَةٌ ہے۔ اور فیض الٰہی کو جَدٌّ کہا جاتا ہے ﴿اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا﴾ [الجن: 3:72] ''ہمارے رب کی عظمت بہت بلند ہے۔'' اور بعض کے نزدیک اس کے معنی عظمت ہیں اور جو اللہ تعالیٰ انسان کو حظوظ دنیوی سے (اپنے فیض سے) عطا فرماتا ہے اسے بھی جَدّ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے [وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ] (صحيح البخاری، كتاب الاذان، باب الذِّكْرِ بَعْدَ الصَّلَاةِ، حديث: 844) حظوظ دنیوی اس کے صاحب کو نفع نہیں پہنچاتے۔ یعنی ثواب آخرت حظوظ دنیا سے نہیں ملتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے ملتا ہے۔ اور جَدّ باپ کے باپ کو اور ماں کے باپ کو بھی کہا جاتا ہے۔ پس جَدّ کے معنی نسب بھی ہوسکتے ہیں۔ (غ)

﴿غَرَابِيْبُ﴾۔ غِرْبِيْب کی جمع ہے اور وہ سیاہی ہے۔ غُرَابٌ یعنی کوے سے مشابہ ہے۔ (غ)

مناظر قدرت کے اختلافات میں مراتب انسانی کے اختلافات کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ اگلی آیت میں واضح کردیا ہے۔

مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

رنگ کئی طرح کے ہیں۔اللہ سے صرف اس کے علم والے بندے ڈرتے ہیں۔اللہ غالب بخشنے والا ہے۔(2722)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾

جولوگ کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے انہیں دیا چھپ کر اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو تباہ نہیں ہوگی۔

لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾

تاکہ وہ انہیں ان کے اجر پورے دے اور اپنے فضل سے انہیں بڑھ کر دے۔وہ بخشنے والا قدردان ہے۔

وَ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۳۱﴾

اور کتاب جو ہم نے تیری طرف وحی کی ہے وہ حق ہے اس کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے ہے۔یقیناً اللہ اپنے بندوں سے خبردار (انہیں) دیکھنے والا ہے۔

2722- **اختلافات قدرت میں تردید تناسخ اور ہستی باری پر دلیل:** پہلی آیت میں نباتات اور جمادات کے اختلافات کی طرف توجہ دلائی ہے۔یہاں انسانوں اور جانوروں کے اختلافات کی طرف۔ان اختلافات کی طرف توجہ دلانے میں ایک طرف عقیدہ تناسخ کی کھلی تردید ہے۔اس لیے کہ اختلافات صرف انسانوں میں اور جانداروں میں نہیں بلکہ جمادات اور نباتات میں بھی ہیں۔پس یہ کسی پہلی پیدائش کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہوسکتے۔کیونکہ جمادات کے لیے اہل تناسخ بھی پہلی پیدائش کوئی نہیں مانتے۔اور دوسری طرف ان تمام اختلافات قدرت کے اندر اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایک دلیل ملتی ہے کہ ایک ہی قسم کی ایک چیز دوسری سے نہیں ملتی۔اسی لیے ساتھ ہی فرمایا کہ علماء اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔یعنی جس قدر زیادہ کوئی شخص ان تغیرات عالم پر غور کرتا ہے اسی قدر زیادہ ﴿خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ اس پر غالب ہوتی ہے،آگے انہی کا ذکر ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ؕ ﴿۳۲﴾

پھر ہم نے کتاب کا وارث ان کو بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چنا۔ سو کوئی ان میں سے اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی ان میں سے میانہ رو ہے، اور کوئی ان میں سے اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔ یہی بڑا فضل ہے۔(2723)

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾

ہمیشگی کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے ان میں انہیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ان میں ریشم ہوگا۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۨ ۙ ﴿۳۴﴾

اور کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔ یقیناً ہمارا رب مغفرت کرنے والا قدردان ہے۔

2723- نظام مذہب کو قائم کر کے اور یہ بتا کر کہ سب نبیوں کے آخر پر ہم نے ایسا نبی بھیجا جو تمام پہلے انبیاء کی تصدیق کرتا ہے، اب بتایا ہے کہ آئندہ دنیا کی ہدایت کے لیے ہم نے جو مکمل کتاب نازل کی ہے یعنی قرآن کریم تو آنحضرت ﷺ یا اُمم سابقہ کے بعد اس کا وارث **امت محمدیہ** کو بنایا ہے جو تمام امتوں میں سے برگزیدہ امت ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرۃ: 143:2] ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تا کہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمہارا پیشرو ہو۔'' اور ﴿اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ اس امت کے متعلق فرما کر اس کے بہترین امت ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن یہ بتا دیا کہ یہ ساری امت بھی ایک رنگ میں رنگین نہیں۔ **اختلاف مراتب** جو دنیا میں ہر جگہ موجود ہے ان میں بھی رہے گا۔ ﴿ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ وہ ہے جو ان ہدایات کی تعمیل میں قاصر رہتا ہے جو دی گئی ہیں۔ ﴿مُّقْتَصِدٌ﴾ یا میانہ رو وہ ہے جو نیک اور بد کے بین بین ہے۔ یعنی نیکی بھی کرتا ہے، کبھی اس سے بدی بھی سرزد ہو جاتی ہے [دیکھو نمبر: 854]۔ اور ﴿سَابِقٌ﴾ وہ ہے جو نیکیوں میں اور خدمات کے بجا لانے میں کمال کو حاصل کرتا ہے اور ترتیب ان لوگوں کی کثرت و قلت کے لحاظ سے ہے۔ یعنی تعداد میں زیادہ قاصر ہیں، پھر میانہ رو، پھر سابق۔ اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ سب اس امت میں سے ہیں اور سب جنت میں جائیں گے۔ ہاں جو ظالم ہیں انہیں اللہ چاہے تو بخش دے اور چاہے تو سزا دے کر جنت دے دے۔

الَّذِیْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

وہ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ٹھہرنے کے گھر میں اتارا نہ ہمیں اس میں مشقت ہوگی اور نہ ہمیں اس میں تکان ہوگی۔ (2724)

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقْضٰى عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾

اور جو کافر ہیں ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے، نہ ان کا کام تمام کیا جائے گا کہ مرجائیں اور نہ کچھ اس کا عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا۔ اسی طرح ہم ہر ناشکرے کو سزا دیتے ہیں۔

وَ هُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِیْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ ﴿۳۷﴾ ع 4 11 16

اور وہ اس میں چلائیں گے ہمارا رب ہمیں نکال دے، ہم اچھے عمل کریں گے نہ وہ جو (پہلے) کرتے تھے۔ کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہ دی تھی کہ اس میں نصیحت حاصل کر لیتا جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا، سو چکھو۔ کیونکہ ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔ (2725)

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾

اللہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جاننے والا ہے۔ وہ سینوں کی باتوں کو (بھی) جاننے والا ہے۔

2724- ﴿لُغُوْبٌ﴾ تکان اور مشقت کو کہا جاتا ہے۔ ﴿وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ [قٓ: 38:50] ''اور تکان نے ہمیں نہیں چھوا'' (غ) اور ﴿لُغُوْبٌ﴾ یعنی تکان نصب یعنی تکلیف یا مشقت کا نتیجہ ہے۔ (ر) ﴿دَارَ الْمُقَامَةِ﴾ سے مراد [دَارَ الْاِقَامَةِ] ہے۔

2725- ﴿یَصْطَرِخُوْنَ﴾ اِصْطَرَاخٌ۔ صَرْخٌ سے باب افتعال ہے جس کی ''ت'' ''طا'' سے بدل گئی ہے۔ معنی اِسْتِغَاثَةٌ یا مدد طلب کرنا ہیں۔ [دیکھو نمبر: 410]

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں حاکم بنایا، سو جو کوئی کفر کرے تو اس کا کفر اسی پر ہے۔ اور کافروں کو ان کا کفر ان کے رب کے نزدیک صرف بغض میں بڑھاتا ہے اور کافروں کو ان کا کفر صرف نقصان میں بڑھاتا ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِیْ مَا ذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

کہہ، کیا تم اپنے شریکوں کو دیکھتے ہو جنہیں تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ انہوں نے زمین سے کیا پیدا کیا ہے یا ان کے لیے آسمانوں میں شرکت ہے یا ہم نے انہیں کتاب دی ہے، تو وہ اس کی کھلی دلیل پر قائم ہیں۔ بلکہ ظالم جو ایک دوسرے کو وعدہ دیتے ہیں، صرف دھوکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَ لَىِٕنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ اپنے رستہ سے ہٹ نہ جائیں۔ اور اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد کوئی نہیں جو انہیں تھام سکے۔ وہ بردبار بخشنے والا ہے۔ (2726)

2726- ﴿تَزُوْلَا﴾ زَالَ کے معنی ہیں ایک چیز اپنے رستہ سے ہٹ گئی ایک طرف کو مائل ہوتی ہوئی ﴿وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ [ابراهيم: 46:14] ''اور گو ان کی چال ایسی ہی ہو کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں۔'' اور اسی سے زوال ہے جو اس چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جو پہلے ثابت ہو۔ اور زوال الشّمس بلحاظ ظاہر کے کہا جاتا ہے۔ اور مَازَالَ اور لَایَزَالُ خاص محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ہمیشہ، اور اس کی اصل یا سے ہے ﴿وَّ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ﴾ [هود: 118:11] ''اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہتے ہیں۔'' ﴿لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ﴾ [التوبة: 110:9] ''ان کی عمارت ہمیشہ رہے گی۔'' ﴿فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَكٍّ﴾ [المؤمن: 34:40] ''مگر تم اس کے بارے میں شک ہی میں رہے۔'' اور یہ گویا دو نفیوں کا اجتماع ہے اس لیے اس کے معنی اثبات کے ہیں۔ (غ)

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ﴿۴۲﴾

اور اللہ کی پکی قسمیں کھاتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آئے تو وہ قوموں میں سے ہر ایک سے بڑھ کر ہدایت والے ہوں گے۔ پھر جب ان کے پاس ڈرانے والا آیا تو اس نے انہیں نفرت میں ہی بڑھایا۔(2727)

اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾

زمین میں تکبر اور بری تدبیریں کرنے لگے اور بری تدبیر کا وبال صرف اس کے کرنے والے پر ہی پڑتا ہے۔ سو یہ پہلوں کے ہی برتاؤ کا انتظار کرتے ہیں۔ سو تو اللہ کے طریق میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔ اور نہ تو اللہ کے طریق کو ٹلتا ہوا پائے گا۔

اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي

اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں۔ پس دیکھتے کہ ان کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے اور وہ قوت میں ان سے بڑھ کر تھے۔ اور اللہ ایسا نہیں کہ اسے کوئی چیز عاجز کر دے (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔

زمین کا رستہ سے ہٹنے کو روکنا صاف بتاتا ہے کہ **زمین بھی حرکت کرتی ہے** اور اس کا ایک رستہ ہے اور آسمانوں کا ہٹنے سے روکنا بتاتا ہے کہ **آسمانوں سے مراد یہاں اجرام سماوی ہیں** جو اپنے اپنے رستوں پر چلتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ قوانین جن سے یہ چیزیں اپنے اپنے رستوں پر چلتی ہیں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اگر ان چیزوں کے مقرر رستے نہ ہوں تو عالم تباہ ہو جائے۔ ﴿لَئِنْ زَالَتَآ﴾ میں اشارہ قیامت کی طرف ہے۔

2727- ﴿اِحْدَى الْاُمَمِ﴾ سے مراد [كُلُّ وَاحِدَةٍ مِّنَ الْاُمَمِ] قریش جب سنتے کہ یہودیوں نے کس طرح اپنے پیغمبروں کو ردّ کیا اور جھٹلایا تو کہتے کہ اگر ہمارے پاس رسول آئے تو ہم اس کی تابعداری کر کے دکھائیں۔

الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾

وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ ع 5 8 17

اور اگر اللہ لوگوں کو اس پر پکڑتا جو وہ کرتے ہیں تو اس کی پیٹھ پر کوئی حیوان نہ چھوڑتا لیکن وہ انہیں ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے سو جب ان کا وقت آجائے گا تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے۔(2728)

2728- ﴿دَآبَّةٍ﴾ سے مراد زمینی لوگ: ﴿وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾﴾ [النحل: 61:16] ''اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر پکڑتا تو اس پر کوئی جاندار نہ چھوڑتا، لیکن وہ انہیں ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے۔ پس جب ان کا وقت آجائے گا وہ ایک گھڑی بھی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ آگے جاسکتے ہیں۔'' یہی مضمون میں ہے۔ ﴿دَآبَّةٍ﴾ ہر زمین پر چلنے والا ہے، مگر مجازاً اس سے مراد وہ لوگ لیے گئے ہیں جو حیوانات کی طرح زمین پر جھکے رہتے ہیں اور اسی زندگی کو حاصل غرض اور مقصد سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے فرمایا ﴿اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ﴾ [الفرقان: 44:25] ''وہ صرف چارپایوں کی طرح ہیں۔'' ظلم یا برے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی گرفت انسانوں پر ہی ہوتی ہے۔ اور انہی انسانوں کا یہاں ذکر ہوسکتا ہے نہ دوسروں کا۔ ﴿يُّؤَخِّرُهُمْ﴾ میں ضمیر هُمْ جو عقلا کے لیے ہے صاف بتاتی ہے کہ یہاں اسی قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ مراد حیوانات نہیں اور سارے لوگ بھی اس میں شامل نہیں۔ اور ﴿دَآبَّةٍ﴾ سے مراد انسان ہونا مفسرین نے بھی مانا ہے۔ (د)

سورۃ یٰسین

نام:

اس سورت کا نام یٰس ہے اور اس میں 5 رکوع اور 83 آیتیں ہیں۔ اس کا نام یٰس پہلی آیت سے لیا گیا ہے اور یہ خطاب اے انسان! آنحضرت ﷺ کو ہے۔ جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسانیت کو آپ نے کمال تک پہنچایا اور اس لیے آپ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے ہی انسان کمال کو حاصل کرسکتا ہے۔ یہی اس سورت کا اصل مضمون ہے۔ اس سورت کو خود زبان مبارک نبوی سے **قلب قرآن** کا خطاب ملا ہے اور اس کے فضائل احادیث میں بہت سے آئے ہیں۔ اور اس کا قلب قرآن ہونا اسی لحاظ سے ہے کہ قرآن کی اصل غرض انسان کو کمال پر پہنچانا ہے اور اسی کا بالخصوص ذکر اسی سورت میں ہے۔ اور بلحاظ ترتیب ظاہری بھی اس کا مقام قلب کا ہی ہے۔

خلاصہ مضمون:

① سب سے پہلے قرآن کو آنحضرت ﷺ کی صداقت پر بطور شہادت پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ قرآن کریم ہے کیونکہ آپ نے جس بات کا دعویٰ کیا ہے اسے قرآن کریم ثابت کردے گا، اور وہ ثابت کرنا عملی طور پر انسانوں کو اس مقام پر پہنچانا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ جن انسانوں کو اس مقام پر پہنچانا ہے ان کی حالت کیسی ہے اور ان میں احساس گویا مر چکا ہے۔

② دوسرے رکوع میں ایک مثال کے رنگ میں سمجھایا ہے کہ وہ قوم جس کی اصلاح کا کام آنحضرت ﷺ کے سپرد براہِ راست کیا گیا ہے اس قابل نہ رہی تھی کہ کوئی موجودہ مذہب ان کی اصلاح کرسکتا۔ اور عملی طور پر پہلے مذاہب اس کی اصلاح کی کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔

③ تیسرے رکوع میں حق کی صداقت کے کچھ نشانات بیان کرکے یہ سمجھایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وجود باجود سے اللہ تعالیٰ ایک مردہ زمین کو زندہ کردے گا۔

④ چوتھے رکوع میں آپ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے والوں کی جزا اور آپ کی مخالفت کرنے والوں کی سزا کا ذکر ہے۔

⑤ اور پانچویں میں بتایا ہے کہ جو قومیں اپنے برسرعروج ہونے کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتی ہیں انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے بھی آخر زوال کا وقت آئے گا اور اللہ تعالیٰ جس کی قدرت اور حکومت تمام اشیاء پر ہے حق کو غالب کرے گا، اور معبودان باطل اپنے پرستاروں کی کوئی نصرت نہ کرسکیں گے۔

اٰیَاتُھَا 83 (36) سُوْرَۃُ یٰسٓ مَکِّیَّۃٌ (41) رُکُوْعَاتُھَا 5

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
یٰسٓ ۝۱	اے انسانِ (کامل)۔ (2728 ل)
وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝۲	حکمت والا قرآن گواہ ہے۔ (2729)

تعلق اور زمانۂ نزول:

پچھلی سورت میں انسانوں کی ربوبیت روحانی کا ذکر تھا اور بتایا تھا کہ اس نے تمام قوموں کی ربوبیت روحانی بذریعہ رسل کے کی، تو اب یہاں یہ بتایا ہے کہ اب انسان کامل محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے تمام انسانوں کی ربوبیت روحانی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ سورتوں کا ایک مجموعہ ہے، یعنی السَّبَا، فَاطِرٌ، یٰسٓ، الصّٰفّٰت، صٓ، الزُّمَر۔ چنانچہ سورۂ سبا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ سے شروع ہوتی ہے اور سورۃ الزمر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ پر ختم ہوتی ہے۔ ان کا مضمون بھی قریباً ایک ہی چلتا ہے اور زمانہ نزول بھی ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ سورت بھی درمیانی مکی زمانہ کی ہے۔

2728ل- ﴿یٰسٓ ۝﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی اے انسان مروی ہیں۔ (ج) اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے یہ معنی لغت حبش یا لغت طے میں ہیں۔ (ر) اور بعض نے اسے اسمائے اللہ یا اسمائے قرآن یا اسمائے رسول اللہ ﷺ میں سے کہا ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ س مقطعات کے طور پر انسان میں سے لیا گیا ہے اور انسان کا لفظ نکرہ لانے سے آپ ﷺ کے کمال انسانیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

2729- ﴿وَ﴾ [دیکھو نمبر: 684] یہ واؤ قسم کی کہلاتی ہے۔ قسم اصل میں کیا چیز ہے؟ انسان کے قسم کھانے کا یہ منشا ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیان کو کسی زبردست شہادت سے مؤید کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کی قسم کھانا:

اب یہ پہلے دکھایا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہی لفظ استعمال ہوتے ہیں جو انسان کے لیے۔ مگر دونوں کے استعمال میں یہ کھلا فرق ہے کہ جب ایک فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا منشا صرف اس فعل کی آخری غرض ہوتی ہے اور وہ آلہ یا ذریعہ کالعدم ہوتا ہے جس کے واسطہ سے انسان اس غرض کو حاصل کرتا ہے۔ جس طرح بنانا ایک فعل ہے۔ جب انسان کسی چیز کو بنائے گا تو وہ آلوں اور ذریعوں کے واسطے سے ایک چیز کو جو پہلے نہیں تھی، وجود میں لائے گا۔ لیکن یہی فعل بنانا جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا تو مطلب صرف اس کا وجود میں لانا ہوگا اور آلے اور ذریعے درمیان میں نہیں رہیں گے۔ پس قسم کی

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۳﴾ کہ تو پیغمبروں میں سے ہے۔

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ﴿۴﴾ سیدھے رستہ پر ہے۔

اصل غرض چونکہ ایک شہادت پیش کرنا ہے اس لیے جب قسم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگی تو مطلب صرف یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ اور شہادتوں سے ایک بیان کو مؤید کرنا چونکہ معیوب نہیں بلکہ ضروری ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کی قسم کھانا بھی معیوب نہیں بلکہ ضروری ہے۔ پس قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کی قسموں پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ صرف کم فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ یعنی یہ خیال کر کے کہ قسم کی غرض کوئی نہیں یہ محض کوئی ڈھکوسلا ہے۔

اقسام قرآن:

غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کی بھی قسم کھائی ہے۔ یعنی اپنی صفت ربوبیت کو بطور گواہ پیش کیا ہے۔ [دیکھو نمبر: 684] نبی کریم ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی ہے، گویا آپ کی پاکیزہ زندگی کو بطور گواہ پیش کیا ہے۔ [دیکھو نمبر: 1702] یہاں قرآن حکیم کی قسم کھائی ہے، گویا قرآن حکیم کو نبی کریم ﷺ کی صداقت کی شہادت میں پیش کیا ہے۔ ملائکہ اور ہواؤں کی قسمیں کھائی ہیں، آسمان اور نجم کی قسم کھائی ہے، مومنوں کی قسم کھائی ہے، جس کا ذکر آگے اپنے اپنے موقعہ پر آئے گا۔ اور سب سے زیادہ ضروری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ بعض وقت آئندہ ہونے والے واقعات کی قسم کھائی ہے، گویا انہیں بطور شہادت پیش کیا ہے۔ اور ان کی شہادت یہ ہوتی ہے کہ ان واقعات کا ہو جانا جن کے لیے بتانے کے وقت کوئی قرائن موجود نہ تھے، ایک کھلا ثبوت اس کلام کی صداقت کا ہو جاتا ہے۔

یہاں **قرآن حکیم کی قسم** کا جواب ہے کہ آنحضرت ﷺ رسولوں میں سے ہیں اور سیدھے رستہ پر ہیں (﴿عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ خبر ثانی ہے۔) پس معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کو آپ کی رسالت پر بطور گواہ پیش کیا ہے۔ گویا یہ آپ کا معجزہ ہے جس سے آپ کی رسالت ثابت ہوتی ہے اور یہ آنحضرت ﷺ کی کل انبیائے عالم پر فضیلت ہے کسی نبی کی کتاب اس کا معجزہ نہیں اور نہ اس کی صداقت پر بطور گواہ پیش کی گئی ہے۔ سوائے قرآن کریم کے۔ انجیل حضرت مسیح علیہ السلام کا معجزہ نہیں نہ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔ مگر قرآن کریم آنحضرت ﷺ کا معجزہ ہے۔ دوسرے انبیاء کے معجزات چند خارق عادت امور ہیں جو ان کے سامنے کے لوگوں نے بھی سب نہیں دیکھے۔ مگر قرآن حکیم وہ معجزہ ہے جو نہ صرف آپ ﷺ کی زندگی میں کل عرب نے دیکھا بلکہ آج تیرہ سو سال سے عرب و عجم، ایشیا و یورپ سب دیکھتے چلے جاتے ہیں اور ہمیشہ تک ساری دنیا دیکھتی چلی جائے گی۔ پس یہی ایک **زندہ معجزہ** ہے۔ اور ضروری تھا کہ جس شخص پر نبوت و رسالت کو ختم کیا جاتا اسے ایسا ہی زندہ اور دائمی معجزہ دیا جاتا۔ پھر یہ صرف معجزہ نہیں بلکہ دلیل بھی ہے۔ ہر ایک معجزہ صرف اس قدر دکھاتا ہے کہ اس کے دکھانے والے کو اللہ تعالیٰ نے معمولی انسانوں سے بڑھ کر کوئی طاقت دی ہے، مگر یہ ایسا معجزہ ہے کہ اس کا اعجاز ہی اس کی صداقت کی دلیل ہے۔ اور ایسی سیدھی اور زبردست

تَنۡزِيۡلَ الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ۙ﴿۵﴾ غالب رحم والے نے اتارا۔(2730)

لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُهُمۡ فَهُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۶﴾ تاکہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے باپ دادے نہیں ڈرائے گئے۔ سو وہ غافل ہیں۔(2731)

لَقَدۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ عَلٰۤى اَكۡثَرِهِمۡ فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷﴾ ان میں سے بہتوں پر بات پوری ہوئی۔ سو وہ ایمان نہیں لاتے۔(2732)

اور دلوں کو کھا جانے والے دلیل ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے لیے کسی اور معجزہ کی ضرورت نہ تھی۔ گو اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے بھی بہتیرے معجزات آپ کو عطا فرمائے۔

ایک بات اور قابل غور یہ ہے کہ یہاں قرآن کے حکیم ہونے کو بطور شہادت پیش کیا ہے یعنی یہ ایک **پُرحکمت کتاب** ہے۔ بلاشبہ ایک امی قوم کے امی انسان کے منجانب اللہ ہونے پر اس سے بڑھ کر کیا شہادت ہوسکتی تھی کہ ان پُرحکمت باتوں کو پیش کیا جائے جو اس کے منہ سے نکلتی ہیں۔ مگر اس نے کہیں سے نہیں سیکھیں۔ یہاں قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کو اور اس کی کامیابی کو بطور اعجاز پیش نہیں بلکہ اس کی حکمت کو پیش کیا ہے۔ اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم نے مذہب کو ایک سائنس اور علم بنا دیا یہ کام دنیا کی اور کسی کتاب نے نہیں کیا۔ ہاں حکمت کی بات پہلے لفظ پرست لوگوں کو سمجھ نہیں آتی لیکن جوں جوں علم ترقی کرتا ہے حکمت کی باتیں خود لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان تیرہ سو سال میں لوگوں نے کیا کیا حکمت کی باتیں اس پاک کتاب سے سیکھی ہیں انہیں چھوڑ کر صرف اسی بات کو دیکھا جائے کہ آج یورپ کس طرح باوجود مسلمانوں کے ساتھ سخت ترین عداوت کے قرآن حکیم کے اصولوں کو تسلیم کرتا چلا جاتا اور ان کے سامنے سر جھکاتا چلا جاتا ہے۔ تو یہ نتیجہ یقینی ہو جاتا ہے کہ جوں جوں **علم ترقی کرے گا قرآن کریم کی صداقت** خود بخود روشن ہوتی چلی جائے گی۔

2730- ﴿تَنۡزِيۡلَ﴾ کی نصب مدح پر ہے اور ﴿الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ۙ﴾ کی طرف سے اس کا اترنا بیان کیا تا معلوم ہو کہ یہ منکروں پر غالب آئے گا اور ماننے والوں کے لیے بڑے بلند مراتب کا موجب ہوگا۔ کیونکہ صفت رحیمیت مومنوں سے خاص ہے۔

2731- اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے حجاز میں کوئی رسول نہیں آیا لیکن ﴿مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُهُمۡ﴾ سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے اَنۡذَار قبول نہیں کیا۔ کیونکہ یہاں ان کی سخت دلی کا ذکر ہے۔ اور ایک رنگ میں یہود و نصاریٰ کے ذریعہ سے ملک عرب کے لوگوں کو انذار ہوا مگر انہوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ اس لیے ان کی حالت غٰفِلُوۡنَ کی تھی یعنی ایسے لوگ جن میں نیکی کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ ایسی قوم کے انذار کو آپ کے سپرد کرنے میں یہ بتایا ہے کہ کس قدر **مشکل وہ کام** تھا جو آنحضرت ﷺ کے سپرد کیا گیا۔ جس قوم کی اصلاح کرنے میں پہلے مذاہب ناکام ہوئے اس کی اصلاح آپ کے ذمے ڈالی گئی۔

2732- کیا قول پورا ہوا؟ عموماً قول ابلیس مراد لیا گیا ہے ﴿لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۙ﴾ [الحجر: 15: 39] ''ان سب کو (حصول مقصد

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝۸

ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈالے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک ہیں۔ سو ان کے سر اونچے کے اونچے رہ گئے ہیں۔ (2733)

میں) ناکام رکھوں گا۔'' اور ابوحیان نے ایک قول اس کے معنی میں نقل کیا ہے کہ مراد رسولوں کا قول توحید ہے اور حق سے مراد ہے کہ اس کی دلیل روشن ہوگئی۔ (د) اور میرے نزدیک قول ﴿فَهُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ہی ہے۔ کیونکہ غافل اسے کہتے ہیں جسے اس چیز کا احساس نہ ہو جس کا احساس ہونا چاہیے۔ [دیکھو نمبر: 1516ب] گویا ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں نیکی اور روحانیت اور اخلاق فاضلہ کا احساس ہی باقی نہیں رہا۔

2733- ﴿مُّقْمَحُوْنَ﴾۔ قَمَحَ اونٹ کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ حوض پر سر اونچا کر لے اور پانی نہ پیئے۔ اور مُقْمَح وہ شخص ہے جو اپنا سر اونچا کیے ہوئے ہے۔ گویا اسے نیچا کر ہی نہیں سکتا۔ اور اِقْمَاحٌ سر کے اونچا اور آنکھ کے نیچا کرنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور [اَقْمَحَهُ الْغُلُّ] کے معنی ہیں کہ طوق کی تنگی کی وجہ سے اس کا سر اونچا رہ گیا۔ (ل) اور [اَقْحَمْتُ الْبَعِيْرُ] کے معنی ہیں اونٹ کے سر کو پیچھے کی طرف باندھ دیا۔ اور ﴿مُّقْمَحُوْنَ﴾ یہاں اس کے ساتھ بطور تشبیہ کے ہے اور مثال کے طور پر۔ اور غرض ان کے اس وصف کو بیان کرنا ہے کہ وہ حق کی فرمانبرداری سے اور رشد کے قبول کرنے سے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کس طرح انکار کر رہے ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ قیامت میں ان کی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ (غ)

گردنوں میں طوقوں کے ہونے سے مراد ان کا **رسم ورواج** وغیرہ میں جکڑا ہوا ہونا ہے۔ [دیکھو نمبر: 1599] اور طوقوں کا ٹھوڑیوں تک ہونا اسی تشبیہ کے لحاظ سے ہے جو ﴿مُّقْمَحُوْنَ﴾ میں ہے۔ کیونکہ جب طوق ٹھوڑی تک ہوگا تو سر بالکل نیچے نہیں ہو سکے گا اور مراد یہی ہے کہ رسم ورواج کے طوقوں نے انہیں ایسے طور پر جکڑا ہوا ہے کہ وہ اپنے سروں کو بالکل نہیں جھکا سکتے۔ اور تیسیر میں ہے کہ اس سے مراد ہے کہ انہیں قبول حق کی توفیق نہیں ملتی یہاں تک کہ وہ حق کے مقابلہ میں تکبر اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ متکبر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی گردن اونچی ہے۔ اور بعض نے اسے ان کے کفر پر پختہ ہونے پر تمثیل لیا ہے، گویا کفر پر اس شخص کی طرح پختہ ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں کہ وہ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ اور ضحاک اور فراء کا قول ہے کہ گردنوں میں طوق ہونے سے مراد ان کا فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے رکنا ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ﴾ [بنی إسرائیل: 29:17] ''اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ۔'' اور قیامت میں ایسا ہونا تو ظاہر ہے۔ کیونکہ جو حالت انسان اپنی اس دنیا میں رکھتا ہے وہی قیامت میں کھلے کھلے طور پر ظاہر ہو جائے گی اور اخلاقی اور غیر مرئی امور ظاہر طور پر نظر آنے لگیں گے۔ آج یہی رسم ورواج کے طوق مسلمانوں کے گلے میں پڑے ہوئے ہیں۔

وَ جَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡہِمۡ سَدًّا وَّ مِنۡ خَلۡفِہِمۡ سَدًّا فَاَغۡشَیۡنٰہُمۡ فَہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۹﴾

اور ہم نے ان کے سامنے ایک دیوار بنادی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے بھی۔ یوں ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ سو وہ نہیں دیکھتے۔(2734)

وَ سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰﴾

اور ان کے لیے برابر ہے کہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لاتے۔

اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکۡرَ وَ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ ۚ فَبَشِّرۡہُ بِمَغۡفِرَۃٍ وَّ اَجۡرٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۱﴾

تو صرف اسے ڈرا سکتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرتا ہے اور رحمٰن سے غیب میں ڈرتا ہے۔ سو اسے مغفرت اور عزت والے رزق کی خوش خبری دے دے۔

اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَہُمۡ ؕ وَ کُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰہُ فِیۡۤ اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ع۱۲﴾

وقف غفران

ع 1 12 18

ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم لکھ لیتے ہیں جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے نشان پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور ہر ایک چیز کو ہم ایک کھلی کتاب میں محفوظ کر لیتے ہیں۔(2735)

2734- ﴿فَاَغۡشَیۡنٰہُمۡ﴾ غِشَاوَۃٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 18] اور اَغۡشٰی کے معنی ہیں پردہ ڈال دیا۔ ﴿کَاَنَّمَاۤ اُغۡشِیَتۡ وُجُوۡہُہُمۡ﴾ [یونس: 27:10] ''گویا کہ ان کے مونہوں پر اڑھا دیا گیا ہے۔''

سامنے اور پیچھے روک ہونا اور پردہ ڈالنا سب اسی معنی میں ہے جیسا کہ طوقوں وغیرہ کا ہونا اور خَلۡفَھُمۡ کی روک یہ ہے کہ وہ عواقب امور پر غور نہیں کرتے گویا ان کی نظر رک گئی ہے اور آگے نہیں جاتی۔ اور ﴿بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ﴾ سے مراد یہ ہے کہ پچھلی تاریخ پر اور قوموں کی حالت پر غور نہیں کرتے گویا اس طرف سے بھی نظر رکی ہوئی ہے اور یہی دو باتیں ہیں۔ یعنی عواقب امور میں فکر کرنا اور پہلی قوموں کی حالت پر غور یا پہلے لوگوں کو جو ایسے ہی افعال پر نتائج ملے ان پر غور کرنا جن سے راہ راست پر چلنے کی توفیق ملتی ہے۔ پس جب یہ دو باتیں نہیں تو گویا ان پر پردہ پڑ گیا اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف ان باتوں کو منسوب کیا۔ اس لیے کہ یہ سب باتیں ان کے افعال کا نتیجہ ہیں۔

2735- **قرآن کریم کا احیائے موتیٰ کا عظیم الشان معجزہ:** ﴿نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی﴾ میں اشارہ انہی کفر پر اصرار کرنے والوں کی

وقف لازم وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اوران کے لیے گاؤں کے رہنے والوں کی مثال بیان کر، جب ان کے پاس رسول آئے۔ (2736)

طرف بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ابھی پچھلی سورت میں ﴿وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ﴾ [فاطر: 22:35] ''اور نہ ہی زندے اور مُردے برابر ہیں۔'' میں کفار کو مردے کہا ہے، اور قیامت کے دن مردوں کا زندہ کرنا بھی مراد ہوسکتا ہے مگر یہاں پہلے معنی انسب ہیں۔ یعنی اول ان کے کفر پر اصرار اور مردہ ہونے کا ذکر کیا اور پھر فرمایا کہ اس قرآن حکیم کے ذریعہ سے ہم ان مردوں کو بھی زندہ کریں گے اور یہ ایسے زندہ ہوں گے کہ نہ صرف اپنے لیے اعمال صالحہ آگے بھیجیں گے جس کا ذکر ﴿مَا قَدَّمُوْا﴾ میں ہے بلکہ وہ اپنے پیچھے علم اور نیکی کے آثار چھوڑیں گے، اس لیے ﴿وَاٰثَارَهُمْ﴾ بھی ساتھ بڑھایا۔ اور فی الحقیقت قرآن کریم نے اپنی صداقت کا ثبوت مردہ عرب کو زندہ کرکے دے دیا اور ایسا ثبوت کسی اور نبی کی زندگی میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہاں اسی طرح بے شمار مردے اس نے زندہ کئے اور آئندہ بھی کرے گا۔ یوں جو دعویٰ شروع رکوع میں کیا تھا کہ قرآن کریم آنحضرت ﷺ کا معجزہ ہے اس کا ثبوت یہاں دے دیا۔ اِمَامٍ بمعنی کتاب کے لیے [دیکھو نمبر: 155]

2736- **انطاکیہ اور حواریین عیسیٰ علیہ السلام:** اس قریہ سے مفسرین نے مراد انطاکیہ لیا ہے اور یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور ﴿الْمُرْسَلُوْنَ﴾ سے مراد قتادہ اور اجلہ مفسرین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری لیے ہیں۔ (ر) اور بعض کے نزدیک یہ اللہ کے رسول تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کے لیے بھیجے گئے۔ اور کہتے ہیں وہ عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی پیروی کرنے والے تھے۔ مگر اول تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پیرو تھے اور دوسرے حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا اور یہ زمانہ فترت ہے۔ پس اگر ان الفاظ میں کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو ﴿الْمُرْسَلُوْنَ﴾ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے ہوں گے اور ان پر لفظ **رسول بطور مجاز** بولا گیا ہے۔ لیکن اول تو ایسا کوئی خاص تاریخی واقعہ عیسائیت کی تاریخ میں نظر نہیں آتا، دوسرے اللہ تعالیٰ نے یہاں صاف الفاظ میں اسے مثال کہا ہے اس لیے تاریخی واقعہ مراد لینا درست بھی نہیں۔ بلکہ یہ صرف مثال کے طور پر ایک بات سمجھائی ہے اور اس میں **عرب کی سخت دلی کا بیان** ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان لوگوں کے احساس مذہبی کی یہ حالت تھی کہ دو رسولوں کا پیغام یکے بعد دیگرے انہیں پہنچایا گیا مگر اس قوم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور یہ دو رسول حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام تھے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ عرب کی اصلاح کے لیے پہلے یہودیوں نے بڑی زبردست کوشش کی اور ناکام رہے اور پھر عیسائیوں نے ہمارے نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بڑی بھاری کوشش کی، مگر ملک عرب پر بحیثیت مجموعی کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اس کا ذکر اسی مناسبت سے کیا کہ عرب کے لوگوں کی سخت دلی کا اوپر ذکر تھا کہ ان میں نیکی کا احساس بھی باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے نہ یہود کے پیغام کی پروا کی نہ نصاریٰ کی اور اس کو بطور مثال یوں بیان کیا کہ ایک بستی ایسی سخت دل ہے جو دو رسولوں کو جھٹلا چکتی ہے تب تیسرا رسول ان کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ اگر اس واقعہ کی طرف اشارہ نہ ہو تو پھر دو رسول پہلے بھیجنے میں اور تیسرا بعد میں بھیجنے میں کوئی خاص غرض نظر نہیں آتی۔

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

جب ہم نے ان کی طرف دو (رسول) بھیجے تو انہوں نے دونوں کو جھٹلایا، تب ہم نے تیسرے سے قوت دی۔ سو انہوں نے کہا ہم تمہاری طرف رسول ہیں۔ (2737)

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَ مَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾

انہوں نے کہا، تم تو ہماری طرح انسان ہی ہو اور رحمٰن نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ ہی کہتے ہو۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

انہوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف ضرور بھیجے گئے ہیں۔

وَ مَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾

اور ہمارے ذمے سوائے کھول کر پہنچا دینے کے اور کچھ نہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾

انہوں نے کہا ہم نے تمہیں منحوس پایا ہے، اگر تم باز نہ آؤ تو ہم تمہیں پتھرا دیں گے اور ہماری طرف سے ضرور تمہیں دردناک دکھ پہنچے گا۔

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

انہوں نے کہا تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہی ہے۔ کیا اس لیے کہ تمہیں نصیحت کی گئی ہے؟ بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔ (2738)

2737- ﴿فَعَزَّزْنَا﴾ عَزّ سے ہے [دیکھو نمبر: 1367] اور عَزَّةٌ بمعنی شدت وقوت بھی ہے اور عَزَّزْتُ کے معنی ہیں قوی کیا، مضبوط کیا۔ (ل)

2738- ﴿طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ﴾ یعنی تمہاری شومئ قسمت کی وجہ تمہارے اپنے اعمال ہیں اور ﴿اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ﴾ کا جواب محذوف ہے یعنی کیا نیک نصیحت کو تم اپنی شومئ قسمت کی وجہ ٹھہراتے ہو یا نیک نصیحت کرنے پر تم ہمیں برا کہتے ہو اور دکھ دیتے ہو۔

وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۲۰﴾

اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا اے میری قوم! رسولوں کی پیروی کرو۔ (2739)

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

ان کی پیروی کرو جو تم سے اجر نہیں مانگتے اور وہ ہدایت پر ہیں۔

2739- مفسرین نے اس کا نام حبیب دیا ہے مگر یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ یہ واقعہ بھی اس تمثیل کا حصہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ رسولوں کی تائید کے لیے کوئی نہ کوئی بااثر شخص اس قوم میں کھڑا ہو جاتا ہے جو لوگوں کو سمجھاتا ہے۔ قرآن کریم میں ﴿رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ [المؤمن: 28:40] ''فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن مرد نے۔'' کا ذکر ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کے لیے یوسف ارمتیاہ کھڑا ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سے نصرت پہنچائی اور بہت سے لوگ آپ کی نصیحت سے داخل اسلام ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ رسولوں کو اللہ تعالیٰ بغیر نصرت کے نہیں چھوڑتا۔